ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

۲۱/ اکتوبر ۹۶ء

☆ صدر کو اپنا کردار ادا کرنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے
☆ سندھ کا "مردہ" آتش فشاں پھر "زندہ" ہو سکتا ہے
☆ طالبان' افغان جہاد کا ہی تسلسل ہیں

حدیث امروز

جنرل (ر) محمد حسین انصاری

طالبان حق

امسال ۲۷ ستمبر کے روز قومی اخبارات میں شائع ہونے والی شہ سرخیاں پس الفاظ یہ نوید سنا رہی تھیں کہ غالباً افغانستان کی بگڑی بننے کو ہے' معلوم ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت کا وعدہ پورا ہوا چاہتا ہے' مسلمانوں کی کوتاہیوں کے نتیجے میں غیروں کے ہاتھوں توہین اسلام کا دور ختم ہونے کو ہو' افغانستان کے دربدر ہوئے عوام الناس کو سکون نصیب ہوتا دکھائی دے رہا ہے اور ممکن ہے روئے زمین پر دین اسلام کے غلبے کے آخری مرحلے کا نقطہ آغاز یہی ہو۔ خبر یہ تھی کہ افغانستان کی جاری جنگ میں طالبان نے کابل پر فتح حاصل کر لی ہے' ربانی حکومت معزول کر دی گئی اور یہ کہ ربانی' حکمت یار' عبدالرسول سیاف اور احمد شاہ مسعود روپوش ہو گئے ہیں۔ یہ خبر کیسی تھی کہ اس نے ہر سو ہلچل مچا دی! افغانستان ہی میں نہیں' پاکستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں لوگ چونک پڑے۔ مختلف تبصرے ہوئے۔ بعض نے اس خبر کو غلط جانا' بعض نے اس خبر کے غلط ہونے کی دعا کی' بعض نے اسے مسلمان بنیاد پرستوں کے غلبے کا الارم کہا' بعض نے افغانستان کی مزید بربادی کا پیش خیمہ بتایا اور بعض نے اسے عارضی اور مختصر دیدہ فریب سراب قرار دیا۔ مسلمان ممالک کے تبصرے بھی معاندانہ تھے۔ کسی نے اسے امریکہ کی ایران دشمن سازش کا حصہ کہا' کسی نے سابق صدر ڈاکٹر نجیب اور اس کے بھائی کو پھانسی دینے اور ان کی لاشوں کی بے حرمتی کو وحشیانہ اقدام قرار دیتے ہوئے طالبان کی مذہبی جنونیت کا رونا رویا' کسی نے طالبان کو امریکہ کا ایجنٹ کہا اور کسی نے پاکستان پر طالبان کی پشت پناہی کا الزام دیا۔

طالبان کی عسکری قوت کے تجزیئے سے قبل ان پر امریکہ کی طاغوتی امداد حاصل کرنے کی غیر اسلامی سازش کے الزام پر غور کر لینا بہتر ہو گا۔ ایران کو یاد ہو گا بلکہ ہر اسلامی ملک کے علم میں ہے' دنیا جانتی ہے' تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ کی کامیابی کا انحصار کلی طور پر امریکہ کی امداد پر تھا۔ اگر امریکی سٹنگر میزائل اور دیگر ہر قسم کے ہتھیار اس وقت جائز تھے' اگر امریکی ڈالر اس وقت حلال تھے تو اب حرام کیوں؟ بلاشبہ افرادی قوت تو افغانی ہی تھی مگر اس حقیقت سے انکار کیونکر ہو سکے کہ امریکہ کی بے حساب مدد کے بغیر روسی قوت کا خاتمہ ممکن نہ تھا۔ امریکی امداد کا مقصد نہ تب دین اسلام کی حمیت تھا نہ اب طالبان کی مدد اسلام دشمنی پر مبنی ہے۔ امریکہ کو اس وقت بھی امریکی مفاد مطلوب تھا اور اب بھی وہی مطلوب ہے۔ البتہ اس امداد کا صحیح استعمال کرنا ہماری آزمائش تھی جس میں ہم نے بدنامی کمائی۔ بوجوہ' پیسے پر مسلمان کی رال ٹپک پڑنا جانی پہچانی حقیقت ہے جس سے اسلام مخالف قوتیں خوب فائدہ اٹھاتی ہیں' اور کیوں نہ اٹھائیں؟ جہاد افغانستان کے دوران پاکستانی عمال کی بددیانتی ضرب المثل کی شکل اختیار کر چکی۔ اوجڑی کیمپ' مشروب ساز فیکٹریاں اور ایوان ہائے رسوخ کے مکینوں کے اثاثے کسے یاد نہیں۔ ایک جانب مالی خیانت اور دوسری جانب گروہی سیاست نے جہاد افغانستان کو گہنا دیا' یہاں تک کہ کعبہ اللہ کی حدود میں بیٹھے کیا گیا وعدہ ایفا نہ ہوا۔ پھر جو حشر ہوا ایک شرمناک کہانی بن گئی۔

روسی افواج کی شکست کے بعد افغان مجاہدین کے مختلف گروہوں کی خانہ جنگی نے جو تباہی مچا دی اور جس طرح جہاد افغانستان کی حرمت کو داغدار کیا وہ ذمہ دار افراد کو اللہ کے حضور مجرمان کے کٹہرے میں ضرور کھڑا کرے گا۔ غالباً ایسی ہی ذہنی کوفت نے طالبان کو دو سال قبل میدان کارزار میں کود جانے پر آمادہ کیا۔ لوگ انہیں دینی مدارس کے طالبان کہتے ہیں' دراصل یہ طالبان حق ہیں جنہوں نے حق کی سربلندی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی' جنہوں نے جہاد افغانستان کے پندرہ لاکھ شہداء کی قربانیوں کی لاج رکھنے کی ٹھانی'

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

قیمت : ۸ روپے

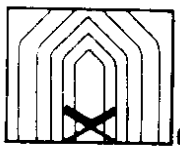

الہدیٰ

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

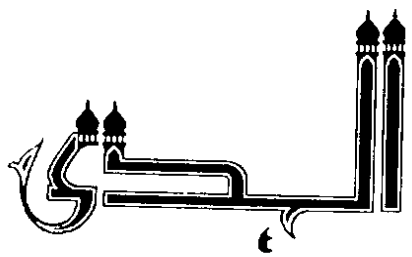

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اور مت پیچھے لگو ایسی چیز کے جس کا تمہیں علم نہ ہو' یقیناً کان' آنکھ اور دل سب ہی کے بارے میں باز پرس ہو کر رہے گی O

(قرآن کریم کی یہ اٹل ہدایت کہ قیاسی علوم کے پیچھے مت لگو اور محض ظن و تخمین' قیافے اور قیاس کو علم کی بنیاد نہ بناؤ بلکہ اپنے مشاہدہ کی قوت اور استدلال کی صلاحیت کو بروئے کار لاؤ' دراصل سائنسی نقطہ نگاہ کے لئے ایک اہم بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے کہ سفلی علوم اور قیافہ شناسی کی بنیاد پر پروان چڑھنے والے تمام علوم میں دلچسپی انسان کو عمل اور فعالیت سے دور کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اللہ نے سماعت و بصارت اور تعقل و تفقہ کی جو صلاحیتیں انسان کو عطا کی ہیں انہیں صحیح رخ پر استعمال کرنے کی بجائے ظن و تخمین اور قیاس و قیافے کو علم کی بنیاد بنانا بہت بڑی ناشکری اور ناقدری ہی نہیں قابل مواخذہ جرم بھی ہے)

اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو' یقیناً تم نہ تو زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو O

(کہ وہ شخص جس کی چال سے کبر و رعونت جھلکتے محسوس ہوں' اس حقیقت سے بے خبر اور غافل ہے کہ کائنات میں اللہ کی عظیم تخلیقات کے مقابلے میں اس کی حیثیت ایک چیونٹی سے زیادہ نہیں۔ وہ اپنی ایڑی کو کتنے ہی زور سے مارتا ہوا چلے زمین کو پھاڑ نہیں سکتا اور کتنا ہی سر اٹھا کر اکڑتا ہوا چلے پہاڑوں کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتا۔ ایسا شخص اللہ کی عظمت سے بے خبر تو ہے ہی' اپنی حقیقت سے بھی غافل ہے)

ان تمام امور میں سے ہر ایک کا برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے O

(کہ مذکورہ بالا تمام امور میں جو برائی کا پہلو ہے اور جس کے کرنے سے ان آیات میں روکا گیا ہے...... مثلاً شرک' قتل ناحق' زنا' تبذیر' بخل' یتیم کا مال ہڑپ کرنا' ناپ تول میں ڈنڈی مارنا' سفلی علوم میں دلچسپی رکھنا' تکبر کرنا وغیرہ...... یہ سب کام پروردگار کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ ہیں اور توحید اور بندگی کا تقاضا تو یہی ہے کہ تم ہر اس چیز کو ترک کر دو جو تمہارے رب کو ناپسند ہو)

یہ ہے وہ حکمت کی باتیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں

(یہ حکمت و دانائی کے وہ موتی ہیں جو ہمارے پروردگار نے بذریعہ وحی ہمیں عطا فرمائے ہیں کہ ان آیات میں جن میں معاشرتی اقدار کا ذکر ہے فکر انسانی کی رسائی وہاں تک ممکن ہی نہیں۔ اتنی متوازن اور مطابق فطرت معاشرتی اقدار تو صرف انسانوں کا خالق اور فاطر فطرت ہی عطا کر سکتا ہے' یہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں)

اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا بیٹھنا کہ پھر تم جہنم میں ڈال دئے جاؤ گے ملامت زدہ اور ہر بھلائی سے محروم ہو کر O

(کہ سب سے اہم ہدایت جو دوسری تمام باتوں کے لئے جڑ اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور جس سے اس سلسلہ بحث کا آغاز ہوا تھا' یہ کہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا اور توحید پر کاربند رہنا کہ بنیاد میں اگر توحید موجود ہے تو شخصیت کی تعمیر بھی صحیح رخ پر ہوگی اور معاشرہ بھی صحیح نہج پر پروان چڑھے گا' بصورت دیگر ہلاکت ہی ہلاکت ہے)

جوامع الکلم

ہجرت یہ ہے کہ تم ہر اس چیز کو چھوڑ دو جو تمہارے رب کو پسند نہیں!

(کہ اگرچہ ہجرت کا عمومی مفہوم کسی ایک جگہ سے ترک سکونت کر کے کسی دوسری جگہ جا آباد ہونے ہی کا ہے لیکن ہجرت کی روح یہ ہے کہ انسان ہر اس کام کو ترک کر دے جس کا کرنا رب کو پسند نہیں یہاں تک کہ رب کی رضا کی خاطر اگر اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہنا پڑے تو اس سے بھی گریز نہ کرے) (الحدیث)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

○

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

بانی مدیر : اقتدار احمد مرحوم

جلد ۵ شمارہ ۳۹

۲۱ / اکتوبر ۹۶ء

21

ایڈیٹر

حافظ عاکف سعید

○

یکے از مطبوعات

تحریک خلافت پاکستان

۴ ۔ اے، مزنگ روڈ، لاہور

○

مقام اشاعت

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون : ۳۔۵۸۶۹۵۰۱

○

پبلشر : محمد سعید اسعد طابع : رشید احمد چودھری

مطبع : مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

○

قیمت فی پرچہ : ۸ روپے

سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) ۱۵۰ روپے

○

زرتعاون برائے بیرون پاکستان

☆ ترکی، اومان، مصر ۱۳ / امریکی ڈالر

☆ سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان ۲۰ امریکی ڈالر

☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ ۲۶ امریکی ڈالر

ایڈیٹر کے ڈیسک سے!

دوسری عالمی خلافت کانفرنس کا انعقاد

تنظیم اسلامی کے اکیسویں سالانہ اجتماع کے موقع پر حسب پروگرام ۴ اور ۵ اکتوبر کو راولپنڈی میں دوسری عالمی خلافت کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کانفرنس میں بیرون پاکستان سے متعدد اہل علم و دانش کی شرکت متوقع تھی لیکن بالفعل صرف ایک مہمان مقرر باہر سے تشریف لا سکے۔ یہ واحد مہمان مقرر ٹرینیڈاڈ (ویسٹ انڈیز) کے جناب عمران این حسین تھے جو اب ایک عرصے سے امریکہ میں سکونت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ تاہم اندرون پاکستان سے جن اصحاب علم و فضل کو اس کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا' بحمد اللہ وہ سب تشریف لائے اور ان مقررین میں چونکہ پاکستان کے قریباً ہر طبقہ فکر کی نمائندگی موجود تھی لہٰذا یہ کانفرنس نہ صرف یہ کہ بہت بھرپور اور کامیاب رہی بلکہ نہایت متاثر کن اور ولولہ انگیز بھی تھی۔ مہمان مقررین میں حیدر آباد سندھ سے مولانا وصی مظہر ندوی' جماعت اسلامی سرحد کی ایک معروف علمی شخصیت مولانا گوہر رحمان' تحریک اسلامی کے قائد مولانا مختار گل' لاہور کے ایک نمایاں عالم دین اور صاحب طرز خطیب مولانا خورشید احمد گنگوہی' اخوت اکیڈمی اسلام آباد کے ڈائریکٹر ریسرچ جناب اکبر ثاقب کے علاوہ شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے لاہور کے ایک نمایاں عالم دین سید ہادی علی نقوی شامل تھے۔ احیاء خلافت کے مسئلہ پر مختلف مکاتب فکر کے علماء کا ایک سٹیج پر جمع ہونا بلاشبہ نہایت خوش آئند اور امت کے اتحاد و اتفاق اور یکجہتی کی جانب ایک پیش قدمی کا مظہر ہے۔

اس خلافت کانفرنس کا افتتاح امیر تنظیم اسلامی اور داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد کے خطاب جمعہ سے ہوا جس کا موضوع تھا "عالمی خلافت کی نوید" اور اختتام بھی محترم ڈاکٹر صاحب کے ایک نہایت اہم خطاب پر ہوا جس میں انہوں نے نظام خلافت کے قیام کے عملی طریقے کی وضاحت نہایت شرح و بسط کے ساتھ کی اور اس اہم موضوع کے جملہ گوشوں کا احاطہ نہایت جامعیت کے ساتھ کیا۔ کانفرنس کے ایک سیشن کی صدارت مظفر آباد آزاد کشمیر کے جید عالم دین مولانا مظفر حسین ندوی مدظلہ' نے فرمائی جبکہ دوسرا سیشن تحریک خلافت پاکستان کے ناظم اعلیٰ جنرل (ر) حافظ محمد حسین انصاری کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس خلافت کانفرنس کی مفصل رپورٹ ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں قارئین کی نذر کی جائے گی۔

☆ ☆ ☆

نیویارک کی جملہ مسلم تنظیموں کی جوائنٹ کمیٹی کے ڈائریکٹر شعبہ علوم اسلامیہ

جناب عمران این حسین کی تنظیم اسلامی میں شمولیت

جناب عمران نذر حسین کی شخصیت جو حالیہ خلافت کانفرنس میں بیرون پاکستان سے تشریف لانے والے واحد مہمان مقرر تھے' قارئین "ندائے خلافت" کے لئے اس اعتبار سے محتاج تعارف نہیں کہ ان کا ایک فکر انگیز مقالہ جو ۱۹۲۴ء میں خلافت کی تنسیخ کے بعد سے ۱۹۶۹ء کی رباط کانفرنس تک عالم اسلام کے کسی متحدہ نظام یا ادارہ کے قیام کی مساعی کے تاریخی جائزے پر مشتمل ہے' گزشتہ چند ماہ کے دوران "گوشہ خلافت" کے عنوان سے بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے۔ (یہ اہم مقالہ اب کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ اور اس کی تقدیم محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تحریر کردہ ہے جس میں جناب عمران این حسین کا مفصل تعارف شامل ہے) موصوف کا شمار شمالی امریکہ کے نمایاں مسلم سکالرز میں ہوتا ہے اور آج کل وہ نیویارک ایریا میں شامل جملہ تنظیموں کی جوائنٹ کمیٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ کے ڈائریکٹر ہیں --- حالیہ خلافت کانفرنس کے موقع پر جناب عمران نذر حسین نے امیر تنظیم اسلامی کے ہاتھ پر بیعت کر کے باضابطہ طور پر تنظیم اسلامی میں شامل ہو گئے ہیں۔ وہ محترم ڈاکٹر صاحب اور تنظیم اسلامی کے نام سے ایک عرصہ سے متعارف تھے اور اب بحمد اللہ انہوں نے تنظیم میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔ امید واثق ہے کہ اب شمالی امریکہ بالخصوص نیویارک میں تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت کی دعوت زیادہ موثر انداز میں پھیلے گی۔ جناب عمران نذر حسین کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے۔

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

کامل انقلاب' انقلاب محمدیؐ ہے

ہم قومی اور ملکی سطح پر مسلسل خودکشی کی طرف بڑھ رہے ہیں

محاسبہ سے انحراف کر کے بے نظیر بھٹو نے یقیناً اپنی اخلاقی حیثیت کو مزید کمزور کیا ہے

اگر حکومت حالات کو سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتی تو صدر کو اپنا کردار ادا کرنا چاہئے

روزنامہ "خبریں" کی ۲۴ ستمبر کی اشاعت میں شائع شدہ امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت کا مفصل انٹرویو

خبریں : ملک میں سیاسی اور اقتصادی بحران کی کیفیت ہے اس کی وجوہات کیا ہیں اور آپ کے نزدیک اس کا حل کیا ہے؟

ڈاکٹر اسرار احمد : اس وقت پاکستان کی جو صورتحال ہے اسے میں نے ایک "مسلسل خودکشی" سے تعبیر کیا ہے۔ ہم قومی اور ملکی سطح پر ایک مسلسل خودکشی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اصل سبب یہ ہے کہ ہم نے پاکستان کے نام سے ایک ایسا ملک بنایا جس کی کوئی جڑ' بنیاد' اساس یہاں تک کہ جواز بھی مذہب کے سوا نہیں ہے۔ نظام عدل کے لئے دین اسلام کو ہم نے ایک سیاسی' سماجی اور معاشی سسٹم کی حیثیت سے قائم نہیں کیا۔ جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ ہمارے وجود کا جواز ہی کمزور ہوتا چلا گیا۔ میں سالہا سال سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر پاکستان میں اسلامی انقلاب نہ آیا اور قائداعظم کی خواہش کے مطابق اسلام کے اصول حریت' اخوت و مساوات کی ایک عملی شکل پاکستان میں قائم کر کے دنیا کو نمونے کے طور پر نہ دکھائی گئی تو پاکستان باقی نہیں رہے گا۔ یا پھر رہے گا تو صرف دوسروں کا آلہ کار بن کر اور دوسروں کے اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لئے قائم رہے گا۔ ہماری قوم میں کوئی جتنا بڑا ہے وہ اتنا ہی بڑا جھوٹا' اتنا ہی بڑا خائن' اتنا ہی بڑا بدعہد اور اتنا ہی بڑا زود رنج اور انتقامی مزاج کا حامل ہے۔ میرے نزدیک ہمارے ملک کی صورتحال کا اصل سبب یہی ہے۔ اس میں کچھ ثانوی اسباب نے بھی جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ان میں سے ایک مسلسل مارشل لاء کا قیام جس کے نتیجے میں قوم سیاسی اعتبار سے مفلوج ہو گئی۔ ایسے میں نہ تو عوام کا سیاسی شعور بیدار ہو سکا نہ

ڈاکٹر اسرار احمد ۲۶/اپریل ۱۹۳۲ء میں ہریانہ (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان نمایاں نمبروں سے پاس کیا۔ دور طالب علمی میں انہوں نے تحریک پاکستان میں سرگرمی سے حصہ لیا اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی ضلعی تنظیم کے جنرل سیکرٹری بھی رہے۔ ۱۹۴۶ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے حسینہ ہال میں ایم ایس ایف کے ایک اجلاس میں قائداعظم بھی تشریف لائے تھے۔ اجلاس میں ہندوستان بھر کے تمام اضلاع کے دو دو نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اپنے ضلع کی نمائندگی ڈاکٹر اسرار احمد نے خود کی تھی۔

پاکستان بننے کے بعد نفاذ اسلام اور تکمیل تحریک پاکستان کے لئے جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ جماعت میں "ہمدرد" رہنے کے بعد آپ اسلامی جمعیت طلبہ میں چلے گئے۔ جمعیت میں پہلے یہ میڈیکل کالج کے ناظم پھر لاہور اور اس کے بعد پنجاب کے ناظم بنائے گئے۔ کچھ عرصہ بعد ہی وہ جمعیت کے مرکزی ناظم اعلیٰ منتخب ہو گئے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے تعلیم سے فراغت اور ایم بی بی ایس مکمل کرنے کے بعد پھر جماعت اسلامی کی رکنیت اختیار کر لی اور تین سال تک جماعت سے وابستہ رہنے کے بعد اصولی اختلافات پر علیحدہ ہو گئے۔ کیونکہ ان کے نزدیک جماعت نے الیکشن کے میدان میں آ کر اپنی اصولی' اسلامی' انقلابی جماعت کی حیثیت کو ختم کر اسلام پسند قومی' سیاسی جماعت کا کردار اختیار کر لیا تھا۔ اس موضوع پر ان کے وقتاً فوقتاً افکار و خیالات کتابوں کے علاوہ اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں اور ان کا ایک تحقیقی مقالہ "تحریک جماعت اسلامی" بھی چھپ کر اہل فکر و دانش کو دعوت فکر دے رہا ہے۔

۶۵ء کے بعد سات سال تک انفرادی طور پر اسلام کا انقلابی پیغام اہل لاہور کی مختلف بستیوں میں پھیلاتے رہے اور اپنی کرشن نگر لاہور میں میڈیکل پریکٹس جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں میں حلقہ ہائے درس قرآن قائم کئے۔ ان کی انہی شبانہ روز کوششوں نے نتیجے میں ۷۲ء میں "مرکزی انجمن خدام القرآن" قائم ہوئی۔ اسی کے تحت قرآن اکیڈمی' قرآن کالج اور کئی ذیلی انجمنیں قائم ہوئیں۔ کراچی' ملتان' فیصل آباد میں بھی قرآن اکیڈمی بن چکی ہیں۔

۷۵ء میں انہوں نے "تنظیم اسلامی" قائم کی۔ ۷۷ء میں انہوں نے "بیعت" کا نظام اختیار کیا۔ پھر انہوں نے تحریک خلافت کی بنیاد رکھی تاکہ پاکستان میں صحیح خطوط پر خلافت کے نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد کی جا سکے۔

جمہوری ادارے ترقی پا سکے اور نہ سیاسی جماعتیں مستحکم ہو سکیں۔

پانچ مسائل کے حل نہ ہونے سے پختہ ہو رہی ہے۔ (۱) امن و امان کا فقدان' (۲) علم و عرفان کا زوال ہمیں دنیا میں سب سے زیادہ کرپشن والی قوم یا یوں کہئے کہ زیادہ کرپٹ قوموں میں دوسرے نمبر پر کہا گیا ہے۔ (۳) مالی بحران' کہ ہم اب دیوالیہ ہونے کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ (۴) سیاسی عدم استحکام (۵) اور سب سے بڑھ کر اخلاق کا دیوالیہ پن۔ یہ تمام صورت حال شدید سے شدید تر ہوتی رہے گی' اگر یہاں ایک حقیقی اسلامی انقلاب نہ آیا۔

خبریں : آپ یہ بھی وضاحت فرمائیں کہ حقیقی اسلامی انقلاب کا راستہ کونسا ہے اور وہ کس طرح ممکن ہے؟

ڈاکٹر اسرار احمد : حقیقی اسلامی انقلاب نہ تو خواہش سے آ سکتا ہے نہ محض دعاؤں سے ممکن ہے۔ نہ محض تبلیغ اور تعلیم و تدریس سے آ سکتا ہے انتخابات سے بھی نہیں آ سکتا۔ پوری دنیا میں کبھی کسی تاریخ کے دوران انقلاب برپا نہیں ہوا اور کسی بھی نظام میں بنیادی' سیاسی' سماجی اور اقتصادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ تاریخ انسانی میں کامل انقلاب کی صرف ایک مثال موجود ہے اور وہ انقلاب محمدی ﷺ ہے۔ انقلاب فرانس اور انقلاب روس بھی جزوی تھے کہ ان میں صرف سیاسی اور معاشی ڈھانچہ تبدیل ہوا تھا۔ مثالی اور کامل انقلاب صرف محمد رسول ﷺ اللہ کا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے تجدید ایمان' توبہ' تجدید عہد کی ایک پرزور دعوت ہو' جو لوگوں کو ذاتی سطح پر اپنے آپ کو بدلنے پر آمادہ کرے یعنی لاکھوں کی تعداد میں ایسے افراد پیدا ہو جائیں جو اپنی ذات اور گھر میں اسلام قائم کریں اور اپنی معاش اور معاشرت کو حرام سے پاک کریں اگر یہ کام نہیں ہو گا تو اسلامی انقلاب کی طرف پہلا قدم بھی نہیں اٹھ سکتا۔

دوسرا اہم مرحلہ یہ ہے کہ ایسے لوگ پھر کسی ایک شخص سے جس کی فہم و بصیرت اور کردار پر انہیں اعتماد ہو وہ شریعت کے دائرے میں رہ کر اس کی بیعت کریں۔ ایک حکم پر پیش قدمی کریں اور پھر جب حکم ملے تو فوراً رک جائیں' ایسی قوت کے فراہم ہو جانے کے بعد بدی کی قوت سے نپٹا جائے گا۔ اس قسم کی جماعت میرے نزدیک پاکستان کے اعتبار سے کم از کم دو لاکھ افراد پر مشتمل ہونی چاہئے۔ لیکن طاقت کا یہ استعمال بھی مسلح بغاوت کی شکل میں نہیں' توڑ پھوڑ کی شکل میں نہیں' کسی کے جان و مال کو نقصان پہنچانے کی صورت میں نہیں' بلکہ منظم اور پرامن احتجاجی تحریک ہو۔

خبریں : اس وقت حکومت اور اپوزیشن میں محاذ آرائی ہو رہی ہے وزیراعظم بے نظیر بھٹو اور اپوزیشن لیڈر میاں نواز شریف کا کردار قومی تقاضوں کو پورا کرتا ہے؟

ڈاکٹر اسرار احمد : نواز شریف ہوں یا بے نظیر بھٹو ہوں میرے نزدیک ان دونوں کا رویہ درحقیقت انہی طویل امراض کی علامات میں سے ہے کہ جن اسباب کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ ہمارے ہاں سیاسی عمل مستحکم نہیں ہو سکا۔ لہٰذا جس طرح کی بری بھلی یا ٹوٹی پھوٹی جمہوریت ہمارے ملک میں قائم ہے اس کے لئے بھی جو رولز آف دی گیم ہیں ان کو ملحوظ خاصر نہیں رکھا جاتا اور اس کا الزام دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں پر جاتا ہے بلکہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ اپوزیشن کا کام ہی صرف ایک ہے کہ وہ حکومت کو چلنے نہ دے اور گرا دے۔ یہی کام نواز شریف کے دور حکومت میں بے نظیر بھٹو نے کیا تھا اور اب یہی کام نواز شریف بے نظیر بھٹو کے خلاف کر رہے ہیں۔ باقی جہاں تک ہماری سماجی ابتری کی بات ہے یا معاشی بدحالی ہے یہ میرے نزدیک نواز شریف یا بے نظیر بھٹو کے طرز عمل کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ ہماری ۵۰ سالہ غلط پالیسیوں کا ایک مجموعی نتیجہ ہے کہ جس سے آج قوم دوچار ہے۔ اس میں ہمیں انصاف سے کام لینا چاہئے اور پوری قوم کا بوجھ چند افراد کے سر پر نہیں رکھ دینا چاہئے۔ البتہ اس وقت مجھے بہتری کی صورت یہ نظر آتی ہے کہ پاکستان میں ۸۵ء کے بعد سے انتخابات کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے نتیجے میں کچھ نہ کچھ سیاسی استحکام ان معنوں میں پیدا ہو گیا ہے کہ اب دو مستحکم پارٹیاں موجود ہیں۔ یہی اس نظام کا ایک بنیادی تقاضا ہے اس میں یقیناً نواز شریف صاحب نے بہت محنت کی ہے' بہت دکھائی ہے' بڑی قربانی دی ہے۔ اس حوالے سے بہتری کی امید کی یہ ایک کرن تو ہے لیکن ابھی ان دونوں کھلاڑیوں نے رولز آف دی گیم کو پورے طریقے سے اختیار کرنے کا رویہ نہیں اپنایا۔ اللہ کرے کہ وہ شکل پیدا ہو جائے۔

خبریں : دینی قوتوں کو سیاست کے میدان بھی بھرپور پذیرائی اور کامیابی حاصل کیوں نہیں ہوتی' کیا دینی جماعتوں اور قوتوں کے پاس کوئی پرکشش اور مکمل سیاسی پروگرام نہیں ہے؟

ڈاکٹر اسرار احمد : اصل میں اس بات کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ کئی صدیوں سے نوع انسانی نے بحیثیت مجموعی اس نکتہ نظر کو اختیار کر لیا ہے کہ مذہب اور سیاست دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ ہمارے ہاں عوام علماء اور مذہبی جماعتوں کی مذہب کی حد تک تو رہنمائی قبول کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔

لیکن جہاں تک سیاست اور اجتماعی نظام کا تعلق ہے وہ ایک دوسری قسم کی شے سمجھی جاتی ہے۔ اس کے لئے کچھ اور ہی صلاحیتیں درکار ہیں---- میں نے سنا ہے کہ عطاءاللہ شاہ بخاری نے اس نکتے کو ایک دفعہ ایک جلسے میں ان الفاظ میں بیان کیا تھا ان کے جلسے میں لوگ انہیں سننے کے لئے تو واقعی بہت زیادہ تعداد میں آتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ "لاہوریو! میں تمہیں خوب جانتا ہوں' تم تقریر بخاری کی سنتے ہو' کتاب مودودی کی پڑھتے ہو' لیکن ووٹ مسلم لیگ کو دیتے ہو۔"

میرے نزدیک ان کا یہ تجزیہ صحیح تھا۔ پھر اسلامی نظام کی طرف عملاً پیش قدمی نہ کرنے کا سب سے بڑا الزام مذہبی جماعتوں پر جاتا ہے کہ انہوں نے انتخابی میدان میں کود کر اقتدار کی کشاکش میں اپنے آپ کو فریق بنا لیا' کبھی ایک کا ساتھ دے کر اور کبھی دوسرے کا ساتھ دے کر کچھ مفادات اور مراعات حاصل کیں۔ میں تیسرے نمبر پر تجزیہ کرنا چاہوں گا کہ ہمارے ہاں دینی تحریکیں صرف دو ہیں جبکہ باقی علماء کی تنظیمیں ہیں۔ جمعیت علمائے اسلام ہو یا اس کے مختلف دھڑے ہوں' جمعیت علمائے پاکستان ہو یا اس کے مختلف گروپ ہوں یا جمعیت اہلحدیث ہو یا تحریک جعفریہ ہو۔ یہ سب مسلکی اور فرقہ وارانہ جماعتیں ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ ان کی حیثیت مولویوں کی ٹریڈ یونین سے زیادہ نہیں ہے اور یہ اسلام کے نفاذ کے عصر حاضر کے اصل تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں۔ اسلام کے ضمن میں ان کی افادیت صرف اس قدر ہے کہ اگر کوئی حکومت اسلام کے کسی نمایاں شعائر میں سے کسی چیز میں سے انحراف کرنے کی کوشش کرے تو یہ اس کے خلاف ایک دفاعی بند باندھ سکتے ہیں اور باندھتے رہے ہیں تو گویا دفاع اسلام کا کام تو یہ کرتی ہیں اور کر سکتی ہیں لیکن مثبت طور پر نفاذ اسلام کے عہد حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں۔ تحریکیں صرف دو ہیں ایک تبلیغی جماعت ہے جو فرقہ واریت سے بالاتر ہے اور بہت بنیادی دینی شعائر اور بنیادی دینی احکام پر لوگوں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتی ہے لہٰذا وہ

خالص غیر سیاسی اور غیر انقلابی جماعت ہے۔ اس طرح اسلامی انقلاب کے اعتبار سے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کے زیر اثر جو دین دار لوگ پیدا ہو رہے ہیں کسی مرحلے پر وہ کسی انقلابی مہم میں ان شاء اللہ ضرور شریک ہو جائیں گے لیکن فی الوقت ابتدائی طور پر اسلامی انقلاب کے لئے ان کا کوئی مثبت رول نہیں ہے۔ دوسری تحریک جماعت اسلامی کی تھی۔ بدقسمتی سے اس جماعت نے پاکستان کی قومی سیاست کے اکھاڑے میں داخل ہو کر اور اقتدار کی کشاکش میں فریق بن کر اپنے آپ کو دلدل میں پھنسا لیا ہے۔ اس طرح وہ بھی بالکل غیر موثر ہو چکی ہے۔

خبریں : فرقہ واریت کا مسئلہ حل کرنے کا موثر طریقہ کیا ہے؟

ڈاکٹر اسرار احمد : ہمارے ہاں اصل میں فرقے صرف دو ہی ہیں اور ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی واقعی کوئی فرقہ وارانہ تقسیم ہے۔ ایک شیعہ اور دوسرے سنی ہیں۔ سنی عظیم اکثریت ہیں اور وہ حنفی ہیں یہ ایک ہی فقہ کو ماننے والے ہیں۔ اگر نفاذ اسلام کے حوالے سے بات آئے تو مسئلہ صرف شیعہ اور سنی کا باقی رہ جاتا ہے۔ اس شیعہ سنی مفاہمت کے ضمن میں پہلا کرنے کا کام بلکہ جس سے کہ سینوں کے مختلف فرقوں میں بھی مفاہمت اور یکجہتی پیدا ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کو بلند تر نصب العین دیا جائے یعنی اسلام کا قیام' نظام خلافت کا قیام' اگر یہ اعلیٰ ترین نصب العین آ جائے گا تو دوسرا کام یہ ہونا چاہئے کہ قرآن مجید کو زیادہ فوکس میں لایا جائے۔ قرآن کی طرف زیادہ متوجہ کیا جائے۔ ایسا کرنے سے فرقہ واریت میں کمی واقع ہوتی چلی جائے گی۔ چنانچہ انہی دونوں کاموں پر میں نے اپنی زندگی کے ۳۰ برس لگائے ہیں۔ ۵۴ میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ساہیوال چلا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۶۵ء میں اپنے مشن کے آغاز کے لئے دوبارہ لاہور آیا۔ آج مجھے ۳۱واں سال ہے کہ میری پوری توانائی انہی دو کاموں کے لئے وقف ہے۔ تیسری بات اس بارے میں یہ ہے کہ میں نے دو سال قبل اہل تشیع کو دعوت دی کہ وہ شیعہ سنی مسئلے کا وہی حل قبول کر لیں جو ایران میں کیا گیا ہے تاکہ مشترکہ اور متحدہ جدوجہد ایک ہی پلیٹ فارم سے کی جا سکے۔ پچھلے سال یہاں ایران سے آیت اللہ واعظ زادہ خراسانی تشریف لائے تھے۔ انہوں نے ہمارے ہاں قرآن کالج میں باقاعدہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا موقف یہی ہے اور آیت اللہ خمینی کا موقف بھی یہی تھا کہ ہر مسلمان ملک میں پبلک لاء وہاں کی اکثریت کی فقہ کے مطابق ہونا چاہئے البتہ پرسنل لاء میں تمام فرقوں اور مسلکوں کو مکمل آزادی ہونی چاہئے۔ آیت اللہ واعظ زادہ خراسانی وہاں پر اسلامی فقہی مذاہب کو ایک دوسرے کے قریب لانے والے اداروں کے سربراہ ہیں۔ جہاں تک اس وقت شیعہ سنی فساد کا تعلق ہے اس میں میں سمجھتا ہوں کہ بین الاقوامی قوتیں بھی کام کر رہی ہیں۔

خبریں : ملی یکجہتی کونسل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے' اس تنظیم کے بارے میں جو اعتراضات کئے گئے ہیں کیا آپ ان سے متفق ہیں؟

ڈاکٹر اسرار احمد : ملی یکجہتی کونسل کے قیام کا میں نے خیر مقدم کیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے مجھے اس میں شمولیت کی دعوت نہیں دی تاہم میں نے اس کے قیام کو خوش آئند قرار دیا تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ وقتی طور پر اس کے مفید اثرات ظاہر ہوئے تھے۔ اس لئے کہ قریب ہونا اور مل بیٹھنا خود بخود مثبت نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اس میں شامل تمام کے تمام گروپ خود خالص زیادہ سیاسی ذہن کے مزاج کے ہیں اور ان کی سوچ اور ترجیحات سے کبھی بھی سیاست کو خارج نہیں کیا جا سکتا لہٰذا یہ اندیشہ تو پہلے سے موجود تھا کہ اس میں سیاسی مفادات کی وجہ سے رخنے پڑ سکتے ہیں اور اختلافات پیدا ہو سکتے ہیں اور اب وہی سامنے آ رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سپاہ محمد ﷺ اور سپاہ صحابہؓ کے اس سے علیحدہ ہونے کے بعد اب سرے سے اس کی کوئی افادیت باقی نہیں رہتی۔

خبریں : آپ کے نزدیک احتساب کے لئے کوئی ایسا فارمولا ہے جس پر اکثریت کو اعتماد ہو' تاکہ ہمارا ملک کرپشن کی دلدل سے نکل جائے؟

ڈاکٹر اسرار احمد : میرے نزدیک احتساب کے نعرے سے سیاسی عمل کو روکنا ہرگز دانشمندی نہیں ہے۔ سیاسی عمل جاری رہنا چاہئے اور اس کے لئے پہلے سے جو بھی احتسابی ادارے موجود ہیں ان کو فعال بنایا جائے۔ مزید بھی ادارے بنا دئے جائیں اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے جیسے کہ نواز شریف نے تجویز پیش کی تھی۔ اس قسم کا کوئی احتسابی ادارہ بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ محاسبہ اچھی بات ہے۔ اس سے انحراف کر کے بے نظیر بھٹو نے یقیناً اپنی اخلاقی حیثیت کو مزید کمزور کیا ہے جو پہلے ہی سے سرے محل کے معاملے میں بہت مجروح ہو چکی تھی' لیکن اس نعرے کو اس سطح پر آگے بڑھانا کہ سیاسی عمل کو روک دیا جائے' میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ احتساب کون کرے گا آسمان سے فرشتے تو نازل نہیں ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ آپ امریکہ سے ورلڈ بینک یا آئی ایم ایف کے کسی کارندے کو امپورٹ کر لیں گے۔ وہ یہاں کے معاشی معاملات کو تو شاید اپنے مفادات کے لئے درست کر لے تاکہ پاکستان کھایا ہوا قرضہ' جو غیر وغیرہ کے ذریعے سے بہت زیادہ دفن ہو چکا ہے اس کو ری کلیم کر سکیں۔ باقی یہ کہ انہیں قیام پاکستان کے مقصد سے کیا دلچسپی ہے بلکہ وہ تو جہاں تک ممکن ہو سکا اس کی جڑیں کھودیں گے۔ اس حوالے سے میرے نزدیک سیاست عمل کا جاری رہنا ضروری ہے اور اس کے تحت جتنا احتساب ہو سکے اس کی کوشش کرنا زیادہ صحیح ہے۔

خبریں : کیا آپ اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ مڈٹرم الیکشن کرانے کی صورت میں بھی ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکیں گے؟

ڈاکٹر اسرار احمد : میرے نزدیک مڈٹرم الیکشن ہو جانے کا فائدہ ہے اور وہ فائدہ وہی ہے کہ جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ مسلسل مارشل لاء کی وجہ سے ہم سیاسی اعتبار سے جس طرح نابالغ رہ گئے بار بار نظام کی طرف عملاً پیش قدمی نہ کرنے کا سب سے بڑا الزام مذہبی جماعتوں پر جاتا ہے کہ انہوں نے انتخابی میدان میں کود کر اقتدار کی کشاکش میں اپنے آپ کو فریق بنا لیا' کبھی ایک کا ساتھ دے کر اور کبھی دوسرے کا ساتھ دے کر کچھ مفادات اور مراعات حاصل کیں۔ میں تیسرے نمبر پر تجزیہ کرنا چاہوں گا کہ ہمارے ہاں دینی تحریکیں صرف دو ہیں جبکہ باقی علماء کی تنظیمیں ہیں۔ جمعیت علمائے اسلام ہو یا اس کے مختلف دھڑے ہوں' جمعیت علمائے پاکستان ہو یا اس کے مختلف گروپ ہوں یا جمعیت اہلحدیث ہو یا تحریک جعفریہ ہو۔ یہ سب مسلکی اور فرقہ وارانہ جماعتیں ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ ان کی حیثیت مولویوں کی ٹریڈ یونین سے زیادہ نہیں ہے اور یہ اسلام کے نفاذ کے عصر حاضر کے اصل تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں۔ اسلام کے ضمن میں ان کی افادیت صرف اس قدر ہے کہ اگر کوئی حکومت اسلام کے کسی نمایاں شعائر میں سے کسی چیز میں سے انحراف کرنے کی کوشش کرے تو یہ اس کے خلاف ایک دفاعی بند باندھ سکتے ہیں اور باندھتے رہے ہیں تو گویا دفاع اسلام کا کام تو یہ کرتی ہیں اور کر سکتی ہیں لیکن مثبت طور پر نفاذ اسلام کے عہد حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں۔ تحریکیں صرف دو ہیں

ایک تبلیغی جماعت ہے جو فرقہ واریت سے بالاتر ہے اور بہت بنیادی دینی شعائر اور بنیادی دینی احکام پر لوگوں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتی ہے لہٰذا وہ خالص غیر سیاسی اور غیر انقلابی جماعت ہے۔ اس طرح اسلامی انقلاب کے اعتبار سے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کے زیر اثر جو دین دار لوگ پیدا ہو رہے ہیں کسی مرحلے پر وہ کسی انقلابی مہم میں ان شاء اللہ ضرور شریک ہو جائیں گے لیکن فی الوقت ابتدائی طور پر اسلامی انقلاب کے لئے ان کا کوئی مثبت رول نہیں ہے۔ دوسری تحریک جماعت اسلامی کی تھی۔ بدقسمتی سے اس جماعت نے پاکستان کی قومی سیاست کے اکھاڑے میں داخل ہو کر اور اقتدار کی کشاکش میں فریق بن کر اپنے آپ کو دلدل میں پھنسا لیا ہے۔ اس طرح وہ بھی بالکل غیر موثر ہو چکی ہے۔

خبریں : فرقہ واریت کا مسئلہ حل کرنے کا موثر طریقہ کیا ہے؟

ڈاکٹر اسرار احمد : ہمارے ہاں اصل میں فرقے صرف دو ہی ہیں اور ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی واقعی کوئی فرقہ وارانہ تقسیم ہے۔ ایک شیعہ اور دوسرے سنی ہیں۔ سنی عظیم اکثریت ہیں اور وہ حنفی ہیں یہ ایک ہی فقہ کو ماننے والے ہیں۔ اگر نفاذ اسلام کے حوالے سے بات آئے تو مسئلہ صرف شیعہ اور سنی کا باقی رہ جاتا ہے۔ اس شیعہ سنی مفاہمت کے ضمن میں پہلا کرنے کا کام بلکہ جس سے کہ سنیوں کے مختلف فرقوں میں بھی مفاہمت اور یکجہتی پیدا ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کو بلند تر نصب العین دیا جائے یعنی اسلام کا قیام' نظام خلافت کا قیام' اگر یہ اعلیٰ ترین نصب العین آ جائے گا تو فروعی کام یہ ہونا چاہئے کہ قرآن مجید کو زیادہ فوکس میں لایا جائے۔ قرآن کی طرف زیادہ متوجہ کیا جائے۔ ایسا کرنے سے فرقہ واریت میں کمی واقع ہوتی چلی جائے گی۔ چنانچہ انہی دونوں کاموں پر میں نے اپنی زندگی کے ۳۰ برس لگائے ہیں۔ ۵۴ میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ساہیوال چلا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۶۵ء میں اپنے مشن کے آغاز کے لئے دوبارہ لاہور آیا۔ آج مجھے ۳۱ واں سال ہے کہ میری پوری توانائی انہی دو کاموں کے لئے وقف ہے۔ تیسری بات اس بارے میں یہ ہے کہ میں نے دو سال قبل اہل تشیع کو دعوت دی کہ وہ شیعہ سنی مسئلے کا وہی حل قبول کر لیں جو ایران میں کیا گیا ہے تاکہ مشترکہ اور متحدہ جدوجہد ایک ہی پلیٹ فارم سے کی جا سکے۔ پچھلے سال یہاں ایران سے آیت اللہ واعظ زادہ خراسانی تشریف لائے تھے۔ انہوں نے ہمارے ہاں قرآن کالج میں باقاعدہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا موقف یہی ہے اور آیت اللہ خمینی کا موقف بھی یہی تھا کہ ہر مسلمان ملک میں پبلک لاء وہاں کی اکثریت کی فقہ کے مطابق ہونا چاہئے البتہ پرسنل لاء میں تمام فرقوں اور مسلکوں کو مکمل آزادی ہونی چاہئے۔ آیت اللہ واعظ زادہ خراسانی وہاں پر اسلامی فقہی مذاہب کو ایک دوسرے کے قریب لانے والے اداروں کے سربراہ ہیں۔ جہاں تک اس وقت شیعہ سنی فساد کا تعلق ہے اس میں میں سمجھتا ہوں کہ بین الاقوامی قوتیں بھی کام کر رہی ہیں۔

خبریں : ملی یکجہتی کونسل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے' اس تنظیم کے بارے میں جو اعتراضات کئے گئے ہیں کیا آپ ان سے متفق ہیں؟

ڈاکٹر اسرار احمد : ملی یکجہتی کونسل کے قیام کا میں نے خیر مقدم کیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے مجھے اس میں شمولیت کی دعوت نہیں دی تاہم میں نے اس کے قیام کو خوش آئند قرار دیا تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ وقتی طور پر اس کے مفید اثرات ظاہر ہوئے تھے۔ اس لئے کہ قریب ہونا اور مل بیٹھنا خود بخود مثبت نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اس میں شامل تمام کے تمام گروپ خود خالص زیادہ سیاسی ذہن کے مزاج کے ہیں اور ان کی سوچ اور ترجیحات سے کبھی بھی سیاست کو خارج نہیں کیا جا سکتا لہٰذا یہ اندیشہ تو پہلے سے موجود تھا کہ اس میں سیاسی مفادات کی وجہ سے رخنے پڑ سکتے ہیں اور اختلافات پیدا ہو سکتے ہیں اور اب وہی سامنے آ رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سپاہ محمد ﷺ اور سپاہ صحابہؓ کے اس سے علیحدہ ہونے کے بعد اب سرے سے اس کی کوئی افادیت باقی نہیں رہتی۔

خبریں : آپ کے نزدیک احتساب کے لئے کوئی ایسا فارمولا ہے جس پر اکثریت کو اعتماد ہو' تاکہ ہمارا ملک کرپشن کی دلدل سے نکل جائے؟

ڈاکٹر اسرار احمد : میرے نزدیک احتساب کے نعرے سے سیاسی عمل کو روکنا ہرگز دانشمندی نہیں ہے۔ سیاسی عمل جاری رہنا چاہئے اور اس کے لئے پہلے سے جو بھی احتسابی ادارے موجود ہیں ان کو فعال بنایا جائے۔ مزید بھی ادارے بنا دئے جائیں اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے جیسے کہ نواز شریف نے تجویز پیش کی تھی۔ اس قسم کا کوئی احتسابی ادارہ بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ محاسبہ اچھی بات ہے۔ اس سے انحراف کر کے بے نظیر بھٹو نے یقیناً اپنی اخلاقی حیثیت کو مزید کمزور کیا ہے جو پہلے ہی سے سرے محل کے معاملے میں بہت مجروح ہو چکی تھی' لیکن اس نعرے کو اس سطح پر آگے بڑھانا کہ سیاسی عمل کو روک دیا جائے' میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ احتساب کون کرے گا؟ آسمان سے فرشتے تو نازل نہیں ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ آپ امریکہ سے ورلڈ بینک یا آئی ایم ایف کے کسی کارندے کو امپورٹ کر لیں گے۔ وہ یہاں کے معاشی معاملات کو تو شاید اپنے مفادات کے لئے درست کر لے تاکہ پاکستان کھایا ہوا قرضہ' جو غبن وغیرہ کے ذریعے سے بہت زیادہ دفن ہو چکا ہے اس کو ری کلیم کر سکیں۔ باقی یہ کہ انہیں قیام پاکستان کے مقصد سے کیا دلچسپی ہے بلکہ وہ تو جہاں تک ممکن ہو سکا اس کی جڑیں کھودیں گے۔ اس حوالے سے میرے نزدیک سیاست عمل کا جاری رہنا ضروری ہے اور اس کے تحت جتنا احتساب ہو سکے اس کی کوشش کرنا زیادہ صحیح ہے۔

خبریں : کیا آپ اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ مڈٹرم الیکشن کرانے کی صورت میں بھی ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکیں گے؟

ڈاکٹر اسرار احمد : میرے نزدیک مڈٹرم الیکشن ہو جانے کا فائدہ ہے اور وہ فائدہ وہی ہے کہ جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ مسلسل مارشل لاء کی وجہ سے ہم سیاسی اعتبار سے جس طرح نابالغ رہ گئے بار بار الیکشن سے اس کی قدرے تلافی ہو گی۔ اب تک ہونے والے الیکشن جس کے نتیجے میں ایک جزو تو وجود میں آیا ہے کہ آج ایک مضبوط اپوزیشن میدان میں ہے اور دو سیاسی پارٹیاں بڑی مستحکم ہیں۔

خبریں : اپوزیشن کی طرف سے صدر مملکت کے بارے میں جس مایوسی کا اظہار کیا جا رہا ہے آپ کی اس حوالے سے کیا رائے ہے' کیا واقعی صدر لغاری اپنے آئینی کردار سے انحراف کر رہے ہیں؟

ڈاکٹر اسرار احمد : میں اس حوالے سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ اپوزیشن نے جو بھی الزامات لگائے ان میں کتنی صداقت ہے' مبالغہ کتنا ہے' اس کا فیصلہ کرنا میرے لئے تو بالکل ممکن نہیں ہے۔ جو شخص بھی اوپر بیٹھا ہے' اب سارا معاملہ اس کی دیانت اور امانت پر ہے۔ اس لئے کہ بہرحال ان کے پاس معلومات حاصل کرنے کے ذرائع بھی زیادہ ہیں اور وہ صحیح تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ان کی دیانت اور امانت کا مسئلہ ہے۔ اس بادے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے نزدیک تو یہ ہے کہ اگر صدر مملکت واقعی اس نتیجے پر پہنچ چکے ہوں کہ حالات اتنے

خراب ہو چکے ہیں اور حکومت ان کو سنبھالنے اور سدھارنے کی کوئی اہلیت نہیں رکھتی تو انہیں اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔

خبریں: آپ نے بتایا ہے کہ آپ کو اپنے مشن کے لئے کام کرتے ہوئے ۳۱ سال ہو چکے ہیں۔ اس دوران صدر ایوب خان' بھٹو صاحب اور پھر ضیاء الحق کا دور آیا۔ ہم آپ سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ ان حکمرانوں کو آپ نے کیسا پایا اور کیا آپ کے نزدیک انہوں نے کوئی اچھا کام بھی کیا؟

ڈاکٹر اسرار احمد: جہاں تک ایوب خان کا تعلق ہے میرے نزدیک ان کا یہ پہلو کہ انہوں نے آمریت نافذ کی اور ملک کے سیاسی عمل کو روکا یہ تو یقیناً غلط اور برا کام کیا جس کی مذمت ہونی چاہئے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ایک مخلص پاکستانی کی حیثیت سے پاکستان کی معاشی اور صنعتی ترقی کے لئے بھرپور کوشش کی۔ ہمارے ہاں اسی کے دور میں ترقی کے سارے منصوبے روبہ عمل آئے تھے لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ ساری چیزیں سیاسی عمل کا نعم البدل نہیں ہو سکتیں۔ جہاں تک بھٹو کا معاملہ ہے میرے نزدیک تاریخ نے ان کو ایک عظیم موقع فراہم کیا تھا اور قدرت نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کے لئے یہ بہت آسانی سے ممکن تھا کہ وہ پاکستان کا ماؤزے تنگ بن جائے لیکن افسوس کہ وہ اپنی جاگیرداری کھال سے باہر نہ نکل سکے' ورنہ اگر وہ کوئی فیصلہ کن اقدام کرتے تو یہاں سے جاگیرداری' سرداری اور سرمایہ داری کا خاتمہ کر سکتے تھے لیکن وہ اس سے محروم رہے۔ اس کے کئی اسباب تھے' داخلی بھی اور خارجی بھی۔ ان کی اپنی شخصیت کے بعض پہلو ایسے تھے کہ جن کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ جہاں تک جنرل محمد ضیاء الحق کا تعلق تو انہیں بھی تاریخ نے ایک عظیم موقع فراہم کیا تھا اور نظام مصطفیٰ کی تحریک میں جوش خروش اور مذہبی جذبہ پاکستان کے عوام نے پیدا کر دیا تھا۔ اس کو وہ اگر بروئے کار لاتے تو وہ عمر بن عبدالعزیز کا مقام حاصل کر سکتے تھے لیکن وہ بھی انتہائی بدنصیب اور ناکام شخص ثابت ہوئے۔ اس کے بھی بڑے اسباب ہیں۔

خبریں: جنرل ضیاء الحق نے آپ کو بہت اہمیت دی اور آپ مجلس شوریٰ میں بھی شامل کئے گئے۔ ٹیلی ویژن پر خصوصی خطاب کا سلسلہ بھی شروع ہوا تھا۔ آپ نے ان سے قربت کے بعد کیا محسوس کیا؟

ڈاکٹر اسرار احمد: جنرل محمد ضیاء الحق مجھ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ میری قدر کرتے تھے۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مسجد خضراء سمن آباد میں میرے درس میں بھی شرکت کرتے تھے۔ انہوں نے جب اپنی پہلی کابینہ برطرف کر دی اور دوسری کابینہ کی تشکیل کرنے لگے تو مجھے پیشکش کی کہ میں بھی ایک وزارت قبول کر لوں۔ ان کے ایک برادر نسبتی سرجن ڈاکٹر نور الٰہی صاحب جو کراچی میں رہتے ہیں' ان کا یہ پیغام لے کر میرے پاس آئے۔ اس وقت ضیاء الحق صاحب عمرے پر روانگی کے سلسلے میں کراچی میں آئے ہوئے تھے۔ میں بھی کراچی اپنے بڑے بیٹے کی شادی کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ وہاں پر ڈاکٹر نور الٰہی صاحب مجھے ملے اور ضیاء صاحب کا یہ پیغام پہنچایا لیکن میں نے اس وقت ہی معذرت کر دی تھی کہ اول تو میں اس کا اہل نہیں ہوں اور اس کوچے میں میں نے کبھی قدم رکھا ہی نہیں تھا۔ چونکہ اصل طاقت فوج کے ہاتھ میں تھی اور وہ کسی صورت میں کوئی کام بھی حکومت کو کھل کر نہیں کرنے دے گی اور الزام سارا کا سارا کابینہ پر آئے گا کہ جس طرح داغدار ہو کر پہلی وزارت نکلی ہے اس طرح کا داغ اٹھانے کے لئے میں تیار نہیں ہوں۔ اس کے کچھ عرصے بعد انہوں نے ایک مجلس شوریٰ بنا لی اور وہ پیشکش میں نے قبول کر لی لیکن شوریٰ میں شرکت کے فوراً بعد ہی یہ محسوس کیا کہ اس ادارے سے کوئی حقیقی فائدہ اٹھانا ان کے پیش نظر نہیں ہے اور یہ صرف امریکی رائے عامہ کو دھوکہ دینے کے لئے بنائی گئی تھی کہ ضیاء الحق کی حکومت صرف ایک فوجی کی حکومت نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ سویلین سیاستدان بھی ہیں' لہٰذا میں نے اس سے بھی استعفاء دے دیا۔ جہاں تک میرے ٹی وی پروگرام کا تعلق ہے یہ حقیقت ہے کہ ضیاء الحق نے خود حکم جاری کیا ورنہ.... میرا گزر کبھی اس وادی میں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس سے پہلے بھٹو صاحب کے زمانے میں ایک دفعہ مجھے دعوت دی گئی تھی کہ آپ ٹی وی پر آ کر جماعت اسلامی کے بارے میں اپنی رائے اور اختلاف بیان کریں تو میں نے اس کا بھی کورا جواب دے دیا تھا کہ میں "حب علی کا قائل ہوں' بغض معاویہ کا نہیں" مجھے تو یہاں تک پی ٹی وی والوں کی طرف سے کہا گیا تھا کہ جو آپ کی رائے ہو گی آپ کھل کر بیان کریں اس پر کسی قسم کا سنسر نہیں کیا جائے گا۔ براہ راست ٹیلی کاسٹ ہو گا لیکن میں نے ایک دفعہ پھر صاف جواب دے دیا کہ "جی نہیں" اس کے بعد یہ پروگرام شروع ہوا جو از خود ٹی وی والوں کی جانب سے شروع ہوا تھا۔ پنڈی اسلام آباد سٹیشن سے جسٹید فرشوری رمضام المبارک کے ایک پروگرام کے سلسلے میں آئے تھے لیکن میرے گھر میں تو آج تک ٹی وی سیٹ نہیں آیا۔ اس لئے میں ٹی وی کی ابلاغی افادیت سے اس وقت کماحقہ آگاہ نہیں تھا۔ اس لئے جب وہ یہ پروگرام لے کر آئے تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کو صرف پندرہ منٹ میں ایک پارے کا خلاصہ بیان کرنا ہے میں نے کہ آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔ مجھے تو ایک آیت کے لئے ایک گھنٹہ چاہئے اور آپ ایک پارے کے لئے پندرہ منٹ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن پھر بعد میں میرے احباب نے مجھے کہا کہ دماغ ان کا نہیں آپ کا خراب ہو گیا ہے۔ ٹی وی پر تو آپ کو پانچ منٹ بھی ملیں تو بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ بہرحال میں نے ٹی وی والوں کو اثبات میں جواب دیا اور میرا پروگرام "الہدیٰ" کے نام سے بہت مقبول ہوا اور یہی پروگرام "الف لام میم" کے نام سے اگلے رمضان المبارک میں بھی ٹیلی کاسٹ ہوا۔ پھر "رسول کامل" کے عنوان سے سیرت نبویؐ پر میری بارہ تقریریں نشر ہوئیں پھر یہ الہدیٰ کا سلسلہ چلا تھا۔ میرا پروگرام یوں ختم ہوا کہ ٹی وی والے مصر تھے کہ اس پروگرام میں خواتین پردہ کئے بغیر آنی چاہئیں۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ اور کہا کہ خواتین اس پروگرام میں آئیں ضرور مگر پردہ کے ساتھ آئیں اور سوالات کریں' میں خوشی سے ان کے سوالات کا جواب دوں گا لیکن بے پردہ خواتین کو میں اس محفل میں نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں البتہ اگر اس وقت ضیاء الحق صاحب چاہتے کہ یہ پروگرام ہو تو بلاشبہ ٹی وی والوں کو ان کی بات ماننا پڑتی۔ البتہ اس پروگرام کی جو پذیرائی ہوئی اس کا احساس مجھے اب تک ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان قوم کے تحت الشعور میں وہ حق موجود ہے کہ جس کی وجہ سے یہ صحیح بات کو پہچان سکتی ہے اور حوصلہ افزائی بھی کر سکتی ہے۔ پورے ملک کے لوگوں نے میرے پروگرام میں دلچسپی لی اور پسند بھی کیا اور الٹرا ماڈرن لوگوں کے بارے میں مجھے یہ رپورٹ ملی کہ انہوں نے بھی اس ٹی وی پروگرام کو بہت غور سے دیکھا تھا جبکہ سیکولر ذہن رکھنے والے اور مغرب کے دلدادہ لوگوں کو یہ بات پسند نہ آئی لیکن مجھے یہ بھی بعد میں معلوم ہوا کہ بعض مذہبی طبقات نے بھی اس کو اپنی انا کی توہین سمجھا۔ ان کو قطعاً یہ گوارا نہیں تھا کہ ایک شخص جو معروف معنوں میں "عالم دین" نہیں ہے اس قدر مقبولیت حاصل کرے.... لیکن میرے اس پروگرام کا خاتمہ اصلاً

ضیاء الحق صاحب کی طرف سے فیصلہ کے بعد ہوا۔ خواتین یا کچھ دوسرے لوگوں کا احتجاج اس سلسلے میں قطعاً موثر ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ میں نے شوریٰ کے اجلاس میں کھل کر یہ کہا تھا کہ آپ الیکشن کے عمل کو مت روکئے' جلد از جلد الیکشن کروائیے' مارشل لاء کا زیادہ طویل ہونا اور الیکشن کے عمل کا رکنا پاکستان کے لئے خود کشی کے مترادف ہے اور اگر آپ نے جلد الیکشن نہ کروائے تو اس ملک میں دہشت گردی کو دوام حاصل ہو جائے گا۔ اس وقت تقریباً ایک ہفتہ قبل ہی کابل میں ایک طیارہ بھی الذوالفقار گروپ نے اغوا کیا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے انہیں یہ کہا تھا کہ جاگیرداری کے خاتمے کے لئے کمیشن بنانا چاہئے۔ پہلی بات ظاہر ہے ضیاء الحق صاحب کو کسی صورت میں پسند نہیں آ سکتی تھی اور دوسری بات ہمارے ملک کے اصل حکمران "جاگیردار ٹولے" کو پسند نہیں آ سکتی تھی اور پھر انہوں نے یہی مناسب سمجھا اور میں سمجھتا ہوں کہ بہت صحیح وقت پر مناسب سمجھا کہ اس آواز کو فوراً دبا دیا جائے۔

خبریں : ڈاکٹر صاحب! اس وقت سیاسی حوالے سے فوج کے کردار پر بحث ہو رہی ہے۔ کچھ لوگ مارشل لاء کے خطرہ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ موجودہ حالات میں کیا آپ کو فوج کا کوئی کردار نظر آتا ہے؟

ڈاکٹر اسرار احمد : پہلی بات تو یہ ہے کہ میں مارشل لاء کا شدت سے مخالف ہوں۔ ضیاء الحق صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۸ / اگست ۱۹۸۰ء کو ہوئی تھی۔ اسی پہلی ملاقات میں میں نے انہیں کہا تھا کہ مارشل لاء کا تسلسل پاکستان کے لئے سیاسی خود کشی کے مترادف ہے۔ میں آج بھی اس رائے پر قائم ہوں۔

مارشل لاء جب بھی لگتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی حکمران ہے اور اس کا شدید ردعمل ہوتا ہے اور پاکستان کے دشمن اس سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں فائدہ اٹھایا اور سندھ کے متعلق بھی میں نے ۸۲ء میں ضیاء الحق صاحب کو یہ کھلا خط لکھا تھا کہ اگر آپ نے جلد ہی یہ گھمبیر صورتحال نہ بدلی تو اس بات کا سخت اندیشہ ہے کہ کہیں مستقبل کا مورخ یہ لکھنے پر مجبور نہ ہو کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے نام سے جو عظیم الشان مملکت قائم ہوئی اسے پہلے تو ایک شرابی ٹولے نے دولخت کیا اور اس کے رہے سہے وجود کے خاتمے کا عمل ایک نمازی اور تہجد گزار کے ہاتھوں ہوا۔ یہ خط میں نے دسمبر ۸۲ء میں لکھا اور ۸۳ء میں وہ لاوا سندھ میں پھٹ گیا۔ اس حوالے سے میرے نزدیک تو مارشل لاء کسی بھی حیثیت سے سود مند نہیں ہے البتہ ملک کی بچھتی سالمیت کو کسی وقت اگر شدید خطرہ لاحق ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ افواج پاکستان جن کی ذمہ داری سرحدوں پر بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنا ہے۔ ایسے ہی اگر ملک میں علیحدگی پسندگی اور متشددانہ رجحانات پنپنا شروع ہوں اور کسی سول حکومت کو فوج کی ضرورت پڑے تو اس میں اس کی مدد کرنی چاہئے جیسا کہ آفات سماوی کے وقت بھی فوج کے جوان سول آبادی کی مدد کے لئے آتے ہیں۔ میری مستقل رائے یہی ہے باقی اس وقت جو صورتحال ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ مارشل لاء تو نہیں آئے گا۔ اگر کچھ ہوا تو یہی ہو گا کہ صدر صاحب اپنے "اختیار خصوصی" سے اس حکومت کو برطرف کر کے ایک ایسی عبوری حکومت کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کریں جو کچھ تو اس ملک کو مالی بحران سے نکال دے اور کچھ فوری طور پر اس وقت پیدا شدہ کشیدگی میں کمی کر دے اور اس کے بعد پھر الیکشن ہو جائیں گے۔

خبریں : آپ جماعت اسلامی میں بھی رہے ہیں۔ اس وقت قاضی حسین احمد حکومت کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں اور تیسری قوت کی حیثیت سے سامنے آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ انہیں کوئی مشورہ دینا پسند کریں گے؟

ڈاکٹر اسرار احمد : میرے نزدیک جماعت اسلامی کی بنیادی غلطی قاضی حسین احمد نے نہیں بلکہ خود مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے کی تھی۔ مولانا نے ۱۹۴۷ء سے شروع کردہ اپنی اصولی انقلابی تحریک میں پاکستان میں آ کر دو قدم اٹھائے جن میں سے ایک صد فیصد درست تھا اور دوسرا اتنا ہی غلط' جو درست قدم انہوں نے اٹھایا وہ یہ کہ انہوں نے اس ملک میں ایک اسلامی دستور کا مطالبہ کیا اور اس کے نتیجے میں ہمیں قرارداد مقاصد حاصل ہوئی اور یہ ان کی بہت بڑی کامیابی تھی.... مولانا مودودی کا ہی مطالبہ آگے بڑھا تھا کہ علماء نے ۲۲ نکات کی صورت میں کہ جب تمام مکاتب فکر کی چوٹی کی قیادتوں نے قوم کو ۲۲ متفقہ سیاسی نکات دے دیئے تھے جو آج کے حالات میں ایک معجزہ نظر آتا ہے لیکن اس کے بعد ۵۱ء میں مولانا نے سب سے بڑی غلطی یہ کی تھی کہ وہ الیکشن کے میدان میں کود پڑے۔ اب ان کے جانشینوں نے اسلام کو ایک سیاسی و انتخابی سٹنٹ بنا لیا ہے۔

مولانا مودودی کو اس معاشرے کے بارے میں جو خوش فہمی تھی یا غلط فہمی تھی وہ پہلے الیکشن میں ہی دور ہو گئی تھی۔ وہ پنجاب کے ۵۱ء کے الیکشن میں ۴۰ سیٹوں پر جماعت کے لوگ کھڑے کر چکے تھے۔ وہ اپنے طریقہ کار کو بھی مسلسل نیچے لاتے چلے گئے کیونکہ پہلے انہوں نے یہ بہترین موقف اختیار کیا تھا کہ الیکشن میں امیدوار بننا حرام ہے' پارٹی ٹکٹ لعنت ہے' عوام کی پنچایتیں بننی چاہئیں' وہ امیدوار کو خود کھڑا کریں اور اس پر یہ واضح کریں کہ آپ ہماری نمائندگی کریں گے اور خرچ بھی خود کریں' لہٰذا اس سے بہتر نظام اور کوئی ہو نہیں سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ معاشرہ تو اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ پھر اس کے بعد وہ نیچے آتے چلے گئے۔ پھر پارٹی ٹکٹ بھی ہو گیا' سب کچھ حلال ہو گیا' بہرحال جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ ۷۰ء کی دہائی کے بعد ۷۱ء میں مولانا مودودی کا ذہن بن گیا تھا کہ الیکشن سے راستے سے اسلام نہیں آ سکتا لیکن اتنے عرصے میں جو جماعت کی قیادت باقی رہ گئی تھی اور بڑی تعداد میں لوگ بکھر گئے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اور دیگر اہم لوگ جماعت اسلامی سے نکل گئے تھے اور جماعت میں باقی جو لوگ رہ گئے تھے ان کی ہڈیوں میں الیکشن اس طرح رچ بس گیا تھا کہ مولانا کی ساری کوششوں کے باوجود جماعت اس نے اس فیصلے پر نظر ثانی نہ کی۔ اسی پالیسی کو لے کر آج قاضی چل رہے ہیں' لہٰذا میں اس کا الزام بنیادی طور پر انہیں دیتا۔

کم از کم مولانا مودودی اپنی جماعت کے معیار اور اس کی طرز تنظیم کو بدلنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے' جبکہ قاضی صاحب نے یہ بات محسوس کی ہے کہ جماعت اسلامی میں شمولیت کی شرائط کو پورا کرنا اس معاشرے کے لئے آسان کام نہیں ہے' لہٰذا اس کا جماعت کی رکنیت سازی پر اثر پڑے گا اور اس کے لئے انہوں نے نئی نئی چیزیں بنانا شروع کر دیں کہ جماعت اسلامی بھی رہے اور کوئی پاسبان بن جائے' کوئی شباب ملی بن جائے' اسلامک فرنٹ بن جائے اور دوسرے لوگوں کو جوڑ توڑ کر کوئی کام بن جائے۔ یہ ان کا مولانا مودودی کے موقف سے انحراف ہے اور اسی سے ان کے ہاں 'خلفشار' ہے اور پچھلے الیکشن میں انہیں جو زعم تھا اور اس کے لئے جو کچھ ہو سکتا تھا سب کچھ کر کے دیکھ لیا۔ اس کے بعد انہیں کم از کم یہ سمجھ لینا چاہئے تھا کہ وہ کوئی متبادل قیادت نہیں ہیں۔ باقی عمران خان ان سے کہیں زیادہ جواں عمر اور بین الاقوامی ساکھ کا حامل اور کچھ بیرونی سہاروں کے ساتھ آ گیا ہے۔ وہ بھی امیدوار ہے۔ جنرل حمید گل

صاحب بھی ایک تیسری طاقت کے امیدوار ہیں ایک اور تیسری طاقت اب غروب ہو چکی ہے۔ وہ اصغر خان تھے' جنہوں نے بہت سے لوگوں کو سیاسی تربیت دے کر بڑے اونچے اونچے مقامات مقامات پر پہنچا دیا اور وہ خود کوئی نمایاں سیاسی مقام حاصل نہیں کر سکے۔ میرے خیال میں قاضی صاحب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

جہاں تک قاضی صاحب کو میرا مشورہ دینے کا تعلق ہے تو میں "مشورہ" وہی دوں گا جو ایک دفعہ میں خود لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ ملاقات میں ان کے سامنے یہ بات رکھی تھی کہ آپ الیکشن کے میدان سے پسپائی اختیار کریں اور ایک احتجاجی تحریک نہی عن المنکر کی بنیاد پر اٹھائیں۔ اس کے ان کو جو فائدے ہوں گے' وہ میں نے ان کو گن کر بتائے تھے۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس ملک کے عوام کو مذہبی جماعتوں سے بڑی شکایت ہوتی ہے کہ وہ ووٹ تقسیم کروا دیتے ہیں اور نتیجتاً سیکولر لوگ جیت جاتے ہیں۔ کم از کم آپ اس الزام سے بری ہو جائیں گے۔

دوسرا فائدہ یہ کہ چونکہ لوگوں کو معلوم ہے کہ چھوٹا یا بڑا ایک ووٹ بینک آپ کے پاس ہے تو تمام مذہبی جماعتیں آپ کا رخ کریں گی اور آپ ان سے شرائط منوا کر ان کے تعاون سے سیاسی سطح پر اپنے پروگرام کی تکمیل کر لیجئے۔ اس سے فرقہ واریت میں کمی ہو گی اور مذہبی حلقے آپ کے قریب آئیں گے۔

تیسرا فائدہ یہ ہو گا کہ الیکشن کے میدان سے ہٹ کر جب آپ نئے پروگرام پر عمل کریں گے تو پھر وہ بات ہو گی جو آپ نے ایک جلسے میں خود کہی تھی کہ ہمیں لیڈر نہیں چاہئیں ہمیں کارکن چاہئیں کہ تمام مذہبی جماعتوں کے کارکن الیکشن سے مایوس ہیں۔ وہ سب سمجھتے ہیں کہ الیکشن سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا۔ تو پھر آپ کے ساتھ ساتھ وہ کیسے آئیں گے جبکہ آپ بھی اسی بات کی طرف بلا رہے ہیں۔ فضل الرحمٰن صاحب کا بھی اپنا ایک ووٹ بینک ہے۔ سیاسی و انتخابی راستے میں ان کے لئے بھی ایک کشش ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ آپ کے ساتھ ملیں' اگر آپ یہ کام کریں گے تو ہر طرف سے قربانیاں دینے والے لوگ کھنچ کھنچ کر آپ کے پاس آئیں گے۔ یہ دلائل میں نے ان کو دیئے تھے لیکن قاضی صاحب نے کہا تھا کہ نہیں یہ دونوں عمل ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ پھر انہوں نے کہا کہ آپ جماعت میں شامل ہو جائیں۔ میں نے کہا اس وقت تو میں آپ کے پاس اپنی تجویز لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اگر آپ بھی جماعت میں شمولیت کی دعوت لے کر میرے پاس آئیں گے تو اس کا جواب میں دے دوں گا۔

بقیہ : مکتوب کراچی

تعالیٰ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت بخشی؟ انصار نے بیک زبان اقرار کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ ۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ درست نہیں کہ تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے میرے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر محبت اور اتفاق عطا فرمایا؟ کیا یہ درست نہیں کہ تم مفلس تھے اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ تمہیں غنی کر دیا؟ اسی طریقہ سے آپ وہ احسانات اور انعامات گنواتے گئے جو آپ کے ذریعہ انصار پر ہوئے تھے۔ اور ہر جملہ پر انصار نے یہی جواب دیا کہ کیوں نہیں یا رسول اللہ ۔

اسی ارشاد کے بعد حضور نے اپنے خطاب کا رخ بدلا اور ارشاد فرمایا۔ اے معشر الانصار تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اے محمد جب تمہاری قوم نے تمہیں جھٹلایا تو ہم تم پر ایمان لائے اور ہم نے تمہاری تصدیق کی۔ میں جواب میں یہ کہوں گا کہ تم صحیح کہتے ہو۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جب تمہیں تمہارے دشمنوں نے ہجرت پر مجبور کیا تو ہم نے تمہیں پناہ دی۔ میں جواب میں کہوں گا تم صحیح کہتے ہو۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اے محمد تمہارا کوئی مدد کرنے والا نہیں تھا۔ ہم نے اپنی جانیں دی ہیں۔ ہم نے اپنا خون بہایا ہے جس کی بدولت تمہیں یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے اور میں جواب میں کہوں گا کہ تم صحیح کہتے ہو۔ نبی اکرم کے اس پر تاثیر خطبے سے جب جذبات کی ایک خاص فضا پیدا ہوئی تو آپ نے ایک بار پھر خطاب کا رخ بدلا اور ارشاد فرمایا یا معشر الانصار۔ کیا تمہیں یہ پسند اور منظور نہیں ہے کہ لوگ اونٹوں' بھیڑوں اور بکریوں کے ساتھ اپنے گھروں کو جائیں اور تم محمد الرسول اللہ کو ساتھ لے کر اپنے گھروں کو لوٹو"

غور کیا جائے تو حضور کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اخلاق و کردار سے اغیار سے لوہا منوایا جبکہ ہمارے قائدین کے اخلاق و کردار کا جائزہ نتیجہ معاشرہ میں فساد ہی فساد ہے پھر بھی دعویٰ ہے کہ نبی کی امت ہیں۔

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS NTN BEARINGS

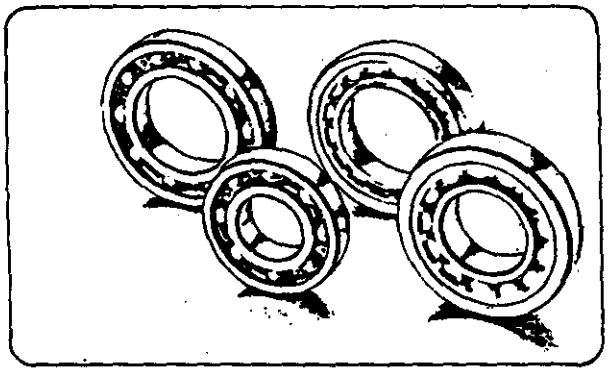

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65, Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph-: 54189

GUJRANWALA : 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

سیاسی پہلو اسلام کا جزو لازم ہے !

دہشت گردی اسلامی انتہاپسندی کا ہی خاصہ نہیں' دنیا کی دیگر انتہاپسند تنظیمیں بھی اس میں ملوث ہیں

ہمارے ذہنوں میں اسلامی بنیاد پرستی کا جو تصور بٹھا دیا گیا ہے وہ صرف دہشت گردی اور انتہاپسندی سے عبارت ہے

جہاں امریکی اسلحے کی کھپت ہے وہاں اسے انسانی حقوق کی کوئی خلاف ورزی نظر نہیں آتی

ایران کی طرف سے دہشت گردی کی سرپرستی کا ابھی تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملا ہے

انسٹیٹیوٹ آف مڈل ایسٹرن اکانومیز (جاپان) کے چیف اکانومسٹ Ryoji Taleyama کی تحریر

جب سے ایران میں انقلاب آیا ہے' ایران سے متعلق جاپان کی پالیسی میں پہلے کی نسبت زیادہ پیچیدگی آ گئی ہے۔ جاپان کے ایران کے ساتھ تعلقات ان تعلقات سے بالکل مختلف ہیں جو اس اسلامی ملک کے ساتھ امریکہ کے ہیں۔ امریکہ میں ایران کو ایک دشمن کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے امریکہ اور جاپان کے درمیان خاصی عدم موافقت پیدا ہوئی ہے۔ گزشتہ برس جب جاپان نے ایرانی انقلاب کے بعد پہلی مرتبہ ایران کو بیرونی ترقیاتی امداد کے تحت ایک ڈیم کی تعمیر کے لئے اڑتیس اعشاریہ چھ بلین جاپانی ین قرض دینے کا فیصلہ کیا تو امریکہ کی طرف سے اس فیصلے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ جس کی وجہ سے اس فیصلے پر عمل درآمد میں دو سال سے زیادہ عرصہ لگ گیا۔ جاپانی حکومت کے اہلکاروں کا کہنا تھا کہ ان دو سالوں میں بڑی مشکل سے امریکی حکومت اور کانگریس کی رضامندی حاصل ہوئی۔ اب بھی امریکی حکومت ایران کے ساتھ تعلقات مضبوط بنانے کے حق میں نہیں۔ قومی سلامتی کے امور میں امریکی صدر کے مشیر انتھونی لیک نے ایران کے بارے میں جاپان جیسے ممالک کے مصالحانہ رویہ کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا ہے کہ "ہم نے یورپی برادری' کینیڈا اور جاپان کے ساتھ ایران کے ان اقدامات کے بارے میں بڑی حد تک اتفاق رائے پیدا کر لیا تھا جو ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہیں لیکن پھر بھی ہمارے بعض اتحادیوں کا خیال ہے کہ علاقائی سطح پر ایران کے ساتھ مثبت طرز عمل اختیار کیا جانا چاہئے حالانکہ تجربے سے پتہ چلتا ہے کہ تجارت اور امداد کی مراعات یا قرضوں کی شرائط میں نرمی جیسی مثبت ترغیبات کے باوجود ایران کے ناقابل قبول رویہ میں کوئی حقیقی تبدیلی نہیں آئی"۔

ایران سے متعلق جاپانی اور امریکی پالیسیوں میں اس لئے عدم موافقت پائی جاتی ہے کہ "اسلامی بنیاد پرستی" کے بارے میں دونوں کے نقطہ نگاہ میں بڑا فرق ہے۔ عالم اسلام میں اس وقت "اسلامی اقدار" اور حقیقی اسلام کے احیاء پر زور دیا جا رہا ہے۔ جس شے کو اسلامی بنیاد پرستی کہا جاتا ہے وہ عقائد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس تک رسائی کے لئے محض ذرائع ابلاغ کے ذریعے ملنے والی معلومات پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ بدقسمتی سے ہمارے ذہنوں میں اسلامی بنیاد پرستی کا جو تصور بٹھا دیا گیا ہے وہ صرف دہشت گردی اور انتہاپسندی سے عبارت ہے۔

جدید اسلام کے احیاء کے بے شمار مظاہر ہیں' یہ مظاہر جمعہ کی نماز کے لئے مساجد میں آنے والوں کی تعداد میں نمایاں اضافے سے لے کر سود سے پاک اسلامی بینکوں کے قیام تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان رجحانات کو "اسلامی بیداری" کا نام دیا جاتا ہے چونکہ اسلام کا تعلق انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ اجتماعیت اور معاشرے سے بھی ہے لہٰذا "اسلامی بیداری" کے عمل میں لامحالہ سیاسی امور بھی شامل ہیں۔ عالم اسلام میں رونما ہونے والے واقعات کو اسی وسیع تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ سیاسی پہلو اسلام کا جزو لازم ہے۔ چونکہ زیر نظر مضمون اسلام کے سیاسی پہلو سے متعلق ہے لہٰذا آئندہ ہم "سیاسی اسلام" کی ترکیب ہی استعمال کریں گے۔ غیر اسلامی ممالک (بشمول یورپ' امریکہ اور جاپان) میں اکثر یہ موقف اختیار کیا جاتا ہے کہ سیاسی اسلام انتہاپسند ہونے کے سبب یا تو براہ راست دہشت گردی میں ملوث ہوتا ہے یا کم از کم دہشت گردی کو تقویت تو ضرور فراہم کرتا ہے۔ اس ضمن میں خصوصاً موجودہ ایرانی حکومت اور الجزائر کی اسلامک سالویشن فرنٹ (FIS) کی مثال پیش کی جاتی ہے جو اپنے قیام سے لے کر آج تک دہشت گردی کی کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ حالانکہ ان سیاسی تنظیموں کا جنہیں خلاف قانون قرار دے کر دبا دیا گیا ہو' تشدد کی راہ اختیار کر لینا حیرت کا باعث نہیں ہونا چاہئے۔ الجزائر میں ایک مسلح اسلامی گروہ GIS (جو غالباً FIS ہی سے الگ ہونے والوں پر مشتمل ہے) اندھا دھند دہشت گردی میں ملوث ہے۔ بعض اوقات اس کا نشانہ غیر ملکی بھی بن جاتے ہیں جہاں تک FIS کا تعلق ہے' تو وہ اکثر اس قسم کی دہشت گردی سے اپنی لاتعلقی ظاہر کرتی رہتی ہے۔ ان کے علاوہ پریس میں جن گروہوں کا تذکرہ آتا ہے وہ افغانستان اور لبنان میں قائم ہیں۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو ان ممالک میں سیاسی دہشت گردی اس طویل خانہ جنگی اور اس کے شدت اختیار کر لینے کا نتیجہ ہے جو ان علاقوں میں لگ بھگ ۲۰ برس سے جاری رہی ہے' ورنہ جب یہ جنگ شروع ہوئی تھی اس وقت وہاں دہشت گردی کا کوئی وجود نہ تھا۔

لبنان میں دہشت گردی ۱۹۸۲ء میں اسرائیل کی دخل اندازی کے بعد شروع ہوئی' جب اس کے نتیجے میں امل (Amal) اور حزب اللہ جیسے مسلح اسلامی گروہ جنگ میں کود پڑے ورنہ اسرائیلی حملے سے پہلے اس لڑائی میں ماروئی Maroniti عیسائی یا عرب قوم پرست اور اشتراکی قسم کے لادینی گروہ ملوث تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہشت گردی اسلامی انتہا پسندی کا ہی خاصہ نہیں ---- دنیا کی دیگر انتہا پسند تنظیمیں بھی اس میں ملوث ہیں۔

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ سیاسی اسلام جمہوریت مخالف ہے لہٰذا اس کا راستہ روکا جانا چاہئے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ اکثر اعتدال پسند اسلامی گروہ جمہوریت کی تائید کرتے ہیں اور جہاں بھی موقع ملے جمہوری سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ مشہور صحافی جوڈتھ ملر نے اسے ریاکاری سے تعبیر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ اسلام پسندوں کی اخلاص' سچائی' عدل اور جمہوریت کے ساتھ وابستگی کے بارے میں شک کا باعث عربوں اور مسلمانوں کی تاریخ اور موجودہ اسلامی گروہوں کی فطرت اور ان کا ارتقاء ہے۔ آگے چل کر وہ کہتی ہیں کہ مشرق وسطیٰ میں شخصی حکومت کو معیار سمجھا جاتا ہے جبکہ متفرق عقائد (Plurality) کو برداشت کرنا' خود احتسابی اور اختلاف رائے کا حق جو آزاد جمہوریت کے لوازم ہیں اگر ناممکنات میں سے نہیں تو ان کا پروان چڑھانا کٹھن ضرور ہے۔

اسلام اور جمہوریت کے بقائے باہمی کے بارے میں متضاد آراء نے اس بحث میں تیزی پیدا کر دی ہے۔ سیاسی اسلام کے علمبردار پارلیمانی جمہوریت کے قیام کے بارے میں مختلف نوعیت کی آراء کا اظہار کرتے ہیں۔ غیر مسلم مبصرین کہتے ہیں کہ اسلام اور جمہوریت کے درمیان بعد فطری امر ہے۔ اس ضمن میں اکثر ریاست اور معاشرے کے باہمی تعلق کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ریاستی اسلام معاشرے کو دبا کر رکھتا ہے جس کے نتیجے میں جمہوریت کے پروان چڑھنے میں رکاوٹ پیش آتی ہے کیونکہ جمہوریت کے لئے آزاد معاشرے کا ہونا ضروری ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ عالم اسلام ایک مستحکم ریاست قائم کرنے میں ناکام رہا ہے جس کی وجہ سے ریاست اور معاشرے کے مابین صحت مند تعلقات کا استوار ہونا ممکن نہیں۔

اسلام اور جمہوریت کی عدم موافقت کے مفروضے پر غور کیا جائے تو یہ جمہوریت کے "مغربی" تصور کی پیداوار معلوم ہوتا ہے' جس کی رو سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ سیاسی اسلام اور اس کی طرف سے مغربی اقدار کی مخالفت کے نتیجے میں کبھی جمہوری قدروں کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار ایک سمپوزیم میں کیا گیا تھا جو مڈل ایسٹ پالیسی کونسل کے زیر اہتمام مئی ۱۹۹۴ء میں واشنگٹن میں "مشرق وسطیٰ میں احیائے اسلام" Resurgent Islam in the Middle East کے عنوان سے ہوا تھا۔ اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ برائے امور مشرق قریب' رابرٹ ایچ پلے ٹریو جونیئر (Robert H.Pelletreau Jr.) نے اعتراف کیا ہے کہ "حکومت کی سطح پر ہمارا اسلام کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں"۔ لیکن ساتھ ہی ان کا یہ کہنا بھی ہے کہ "احیاء اسلام کے بعض مظاہر شدت سے مغرب مخالف ہیں۔ ان کا مقصد نہ صرف مغرب کے اثرات کا خاتمہ ہے بلکہ مغرب کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعاون کی مزاحمت کرنا ہے۔" اس سے انہوں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ "ایسے رجحانات واضح طور پر امریکی مفادات کے خلاف ہیں"۔

پلے ٹریو نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ منطقی طور پر قابل قبول نہیں ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔ کہ جمہوریت' جدید معاشرتی نظام' معیشت اور سیاست سے متعلق بہت سے تصورات مغرب میں تشکیل دیئے گئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ بعد میں عرض کروں گا یہی کل نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آج جاپان کئی اعتبارات سے ایک اچھا خاصا مغرب زدہ ملک ہے' اس کے باوجود جاپانی معاشرہ جن بنیادوں پر استوار ہے وہ بنیادیں خالصتاً مشرقی اور "جاپانی" ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے اکثر صریحاً مغرب مخالف ہیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جاپانی معاشرہ امریکی مفادات کے لئے خطرے کا باعث ہے۔

مسٹر پلے ٹریو کے خیالات تو پھر بھی بہت حد تک صلح کن اور معتدل نظر آتے ہیں' ان کے مقابلے میں مڈل ایسٹ کوارٹرلی کے ایڈیٹر ڈینل پائپس کھل کر کہتا ہے کہ "اگرچہ بنیاد پرست گروہ اور نظریات کئی اعتبارات سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن انتہا پسندی اور ہماری تہذیب سے نفرت ان تمام میں قدر مشترک ہے۔ یہ نفرت ہمارے کام سے نہیں' ہمارے وجود سے ہے۔ بنیاد پرست جس طرز زندگی کے متلاشی ہیں وہ ہمارے مقصودات کی کامل نفی ہے۔ لہٰذا امریکی حکومت کو اصولی طور پر کبھی بھی بنیاد پرستوں کی طرف تعاون کا ہاتھ نہیں بڑھانا چاہئے۔ ان کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کے ساتھ بات چیت سب بیکار ہیں" وہ کہتا ہے کہ "جس طرح ۱۹۵۰ء کی دہائی میں اشتراکیوں کا ایک جال (Network) قائم ہو گیا تھا اسی طرح کا ایک بین الاقوامی جال اس وقت قائم ہو رہا ہے جو بنیاد پرستوں کی طاقت کا باعث ہے۔ یہ نیا جال اس پرانے جال کی طرح امریکہ کو نشانہ بنانا چاہتا ہے"۔

جبکہ حقیقت بہت حد تک اس کے برعکس ہے۔ جس طرح ۱۹۵۰ء کی دہائی میں اشتراکیوں کے "جال" کا کوئی حقیقی وجود نہ تھا' اسی طرح آج بھی کوئی بین الاقوامی اسلامی سیاسی "جال" موجود نہیں ہے۔ پائپس کے دعووں سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ احیائے اسلام کی کوششوں کو امریکہ کے لئے سرد جنگ کے بعد ایک نئے "دشمن" کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہے۔ ایسی باتوں کی سوائے سیاسی پروپیگنڈے کے کوئی حیثیت نہیں۔ ان کا مقصد کلنٹن انتظامیہ کی دہری مزاحمتی (double containment) پالیسی کے لئے جواز فراہم کرنا ہے تاکہ بیک وقت ایران اور عراق دونوں کو ان کی حدوں کے اندر رکھا جا سکے۔

ہم ایک مرتبہ پھر انتھونی لیک کے اس مقالے کی طرف آتے ہیں جو "فارن افیرز" میں چھپا ہے۔ اس میں ایران کی ناکہ بندی کے جواز کے لئے مندرجہ ذیل وجوہات پیش کی گئی ہیں:

- فوجی طاقت میں اضافے کے عمل کو شدت سے آگے بڑھانا
- دہشت گردی اور قتل کی سرپرستی
- مشرق وسطیٰ میں امن کے عمل کی مخالفت
- حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں سے چشم پوشی

یہ درست ہے کہ ایران میں حقوق انسانی کی صورت حال خوفناک ہے اور ایران مشرق وسطیٰ میں جاری امن کے عمل کا کھلم کھلا مخالف ہے لیکن ایران کی طرف سے دہشت گردی کی سرپرستی کا ابھی تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملا ہے۔ اس کے برعکس جب ہم لندن کے بین الاقوامی انسٹی ٹیوٹ آف سٹریٹجک سٹڈیز کے فراہم کردہ اعداد و شمار کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ گلف کوآپریشن کونسل (GCC) سمیت چھ عرب ممالک کا ۱۹۹۲ء میں کل دفاعی بجٹ ۱۲۸ اعشاریہ دو بلین ڈالر تھا جس کے مقابلے میں ایران کا بجٹ صرف ایک اعشاریہ آٹھ بلین ڈالر تھا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ایران اپنی فوجی طاقت میں بے پناہ اضافہ کر رہا ہے' حقیقت پر

مبنی نظر نہیں آتا۔

۱۹۹۱ء میں اسلحے کی خریداری سمیت ایران کے فوجی اخراجات کا تخمینہ ۵ اعشاریہ آٹھ بلین ڈالر تھا۔ اس کے مقابلے میں ۱۹۹۲ء میں سعودی عرب کے اخراجات ۳۵ بلین ڈالر تھے لہٰذا GCC ممالک کے فوجی اخراجات میں بے تحاشا اضافہ پر ایران کی تشویش قدرتی بات ہے۔

خلیج کی جنگ کے فوراً بعد مشرق وسطیٰ میں اسلحے پر پابندی کی ضرورت کا شدید احساس پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ صدر بش نے اس کے لئے ایک منصوبے کا اعلان بھی کیا تھا' اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کے بعد سے اسلحے کی دوڑ میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ لائبریری آف کانگرس کی ریسرچ سروس کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۹۳ء میں امریکہ نے تیسری دنیا کو اسلحے کی فراہمی پر ۱۴ اعشاریہ آٹھ بلین ڈالر خرچ کئے جو پوری دنیا کی طرف سے تیسری دنیا کو اسلحے کی فراہمی کا ۷۳ فیصد ہے۔ اس ۱۴ اعشاریہ آٹھ بلین ڈالر کا ۸۰ فیصد' یعنی ۱۱ اعشاریہ سات بلین ڈالر کا اسلحہ صرف سعودی عرب اور کویت کو فراہم کیا گیا۔ جہاں اتنی بڑی مقدار میں امریکی اسلحے کی کھپت ہے وہاں اسے انسانی حقوق کی کوئی خلاف ورزی نظر نہیں آتی۔

جیسا کہ اکثر ناقدین اس جانب اشارہ کرتے رہے ہیں' امریکہ کی دہری مزاحمتی پالیسی خلیج فارس میں طاقت کے بنیادی متحرکات کو نظر انداز کر جاتی ہے۔ خلیج کے علاقے میں طاقت کے تین مراکز ہیں' یعنی ایران' عراق اور سعودی عرب۔ ان میں سب سے کمزور سعودی عرب ہے۔ پڑوسی ممالک کے ساتھ جن میں ترکی اور GCC کے دیگر ممالک شامل ہیں' ایران کے کئی سطحوں پر تعلقات موجود ہیں' اور یہ تعلقات ایرانی خطرے کے باوجود برقرار رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ مصر بھی جو ایران کا شدید ترین مخالف ہے ایران کے ساتھ تعلقات بحال کرنے کے لئے تیار ہے۔ گزشتہ ستمبر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے دوران ایران اور مصر کے وزرائے خارجہ نے ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کی تھی اور معاشی روابط اور دیگر تعلقات بڑھانے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ جس وقت ایران اور سوڈان کے خلاف مصری حکومت کی مہم زوروں پر تھی' میری دو مصری صحافیوں سے ملاقات ہوئی تھی' ان دونوں کا کہنا تھا کہ مصری حکومت محض اندرونی مسائل سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے سارا ڈرامہ کر رہی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایران کے خلاف مصر کی حکومت کی مہم جوئی سے وہاں کے عوام متاثر نہیں تھے۔

سیموئیل ہنٹنگٹن نے خارجہ امور سے متعلق اپنے مشہور مقالے "Clash of Civilizations? The" میں لکھا تھا کہ انسانی حقوق' مساوات' آزادی' قانون کی حکمرانی' جمہوریت' آزاد منڈی اور مذہب اور ریاست کی علیحدگی مغربی تصورات ہیں اور ضروری نہیں کہ اسلامی' کنفیوشین' جاپانی' ہندی' بدھ یا اصول پرست مشرقی معاشروں میں ان تصورات کو وسیع پیمانے پر پذیرائی حاصل ہو۔ ان کی یہ بات درست ہے کہ یہ نظریات زیادہ تر مغرب میں پروان چڑھے ہیں۔ لیکن جیسا کہ مسٹر ہنٹنگٹن کے علم میں ہوگا کہ ان تصورات کا نوع انسانی کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور یہ مغرب کی خصوصی ملکیت نہیں ہیں۔ ہر معاشرے نے ان تصورات کو اپنے مخصوص تاریخی ماحول کے حوالے سے پروان چڑھایا ہے۔

اس لحاظ سے یہ کہنا کہ اسلامی اور عرب ممالک کبھی بھی انسانی حقوق' جمہوریت یا قانون کی حکمرانی جیسے تصورات کو اپنے ہاں جگہ نہیں دیں گے' مطلقیت کی بدترین مثال ہے۔ اس قسم کے دلائل میں تاریخ کا پہلو سامنے نہیں رکھا جاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ رویہ یحییٰ سوسکی کے الفاظ میں "نئی مستشرقیت" ہے۔ یہ خطے ۱۹ویں صدی سے نوآبادیاتی اور سامراجی طاقتوں کے تسلط میں رہے ہیں۔ ایک طویل عرصہ یورپ نے ان پر حکمرانی کی ہے' اس لئے لامحالہ ان ممالک میں حقوق اور آزادی کے حصول کی جدوجہد ان بیرونی حکمرانوں کے خلاف تھی۔ اگرچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد بیشتر اسلامی اور عرب ممالک نے آزادی حاصل کر لی تھی' اس کے باوجود برطانوی' فرانسیسی اور بعد میں امریکی اور سابقہ سوویت یونین کے اثر و رسوخ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد ختم نہیں ہوئی۔ مزید براں جیسا کہ اس خطے میں متعدد جنگوں سے یہ بات کھل کر سامنے آ چکی ہے' آزادی کے وقت جو سرحدیں قائم کی گئی تھیں وہ کسی قاعدے یا ضابطے کے تحت قائم نہیں کی گئی تھیں۔ بیرونی آقاؤں نے اہم لسانی اور مذہبی عوامل کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی مرضی سے یہ سرحدیں مقرر کر دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرب اور دیگر اسلامی ممالک کی تمام تر توجہ اندرونی مسائل پر قابو پانے پر مرکوز رہتی ہے۔ مغرب مخالف خیالات اور نظریات کو ہوا دینے کے لئے استبدادانہ سیاسی نظام کا سہارا لیا گیا ہے۔ یہی معاملہ اکثر دوسرے ایشیائی ممالک کے ساتھ بھی ہے۔ ورنہ ان میں کوئی بھی ایسی شے نہیں ہے جو عرب اور دیگر اسلامی ممالک میں مستقبل میں انسانی حقوق اور جمہوریت کے پروان چڑھنے میں رکاوٹ کا باعث ہو۔ لیکن اس سے مراد مغربیت بھی نہیں۔

جوڈتھ ملر نے مشرق وسطیٰ کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ضرورت سے زیادہ مایوسی کا اظہار کیا ہے کہ "تکثیریت (Pluralism) خود احتسابی اور اختلاف رائے کا حق جو آزاد جمہوریت کے لوازم میں سے ہیں' ان کا مشرق وسطیٰ میں پروان چڑھنا اگر ناممکن نہیں تو مشقت طلب ضرور ہے۔

بہرحال مغرب میں بھی یہ معیارات راتوں رات پیدا نہیں ہو گئے تھے۔ ان تصورات کو جڑیں پکڑنے میں صدیوں کی سیاسی جدوجہد کام آئی ہے۔

موجودہ سیاسی اسلام بھی اپنی تاریخ اور ثقافت سے انحراف کئے بغیر نئے سیاسی اور سماجی نظام وضع کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ان کوششوں سے آنکھیں پھیر کر سیاسی اسلام کو دشمن سمجھ لینا بجائے خود تکثیریت کی نفی سے کم نہیں۔

(MSANEWS)

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کا نہایت جامع خطاب بعنوان:

تنظیم اسلامی کی دعوت

کتابی شکل میں دستیاب ہے

عمدہ طباعت' صفحات ۵۲ قیمت ۸ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کے دو خطابات پر مشتمل بعنوان:

عیسائیت اور اسلام

کتابی شکل میں دستیاب ہے

عمدہ طباعت' صفحات ۵۶ قیمت ۸ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور

سندھ کا "مردہ" آتش فشاں پھر "زندہ" ہو سکتا ہے!

جی ایم سید نے کہا تھا "سندھیوں کو روہڑی کے اس پار نہیں جانا چاہئے"

سندھ میں مثبت اور منفی رویوں کی نشان دہی پر مشتمل ایک فکر انگیز مضمون

محمد بدر منیر

سندھ ہنوز "آتش فشاں" ہے' اگرچہ مشرق بعید کے آتش فشاں کی طرح یہ "مردہ" ہے لیکن اس میں کسی بھی وقت زندگی کے آثار نمودار ہو سکتے ہیں۔ گزشتہ ایک عشرے سے بالخصوص اور اڑھائی عشرے سے بالعموم سندھ میں ناراضی کی لہر شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ مختلف لسانی طبقے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں' کبھی تو وہاں قیامت کا منظر ہوتا ہے اور کبھی کچھ دیر کے لئے انٹرول ہوتا ہے تو لوگ یہ سمجھ کر سکون کا سانس لیتے ہیں کہ یہ امن دائمی ہو گا لیکن یہ آتش فشاں پھر اچانک پھٹ پڑتا ہے اور امن ایک خواب پریشاں بن جاتا ہے۔ سندھ کے بارے میں ان گنت روایات اور کہاوتیں معروف و مشہور ہیں۔ بزرگ رہنما جناب جی ایم سید مرحوم کہا کرتے تھے کہ "سندھیوں کو روہڑی کے اس طرف جانے میں احتیاط کرنا چاہئے"۔ وہ ایک محفل میں دوران گفتگو اپنا یہ قول دہرا رہے تھے کہ میں نے گذارش کی۔

آخر کیوں؟

جواب ملا ---- میرے بزرگوں نے سرمست کو دہلی جانے سے بار بار روکا لیکن وہ باز نہ آیا اور دہلی چلا گیا' اورنگ زیب نے اس کا سر اڑا دیا۔ ہم سندھیوں نے سرمست کو ایک لمبے عرصے تک برداشت کیا لیکن دہلی والے اسے چند ہفتے بھی برداشت نہ کر سکے۔ میں نے بھٹو کو بھی منع کیا کہ روہڑی کے اس طرف مت جانا لیکن وہ نہ مانا بالآخر راولپنڈی والوں نے اسے پھانسی پر لٹکا دیا۔ میں نے اس کی نیانی (بیٹی) کو بھی منع کیا لیکن نہ جانے راولپنڈی میں کیا کشش ہے کہ اپنے باپ کے حشر سے بھی اس نے سبق نہیں سیکھا' پھر اسے ڈسمس کر کے نکال دیا گیا' میں نے اسے کہا۔ یہ وارننگ ہے' اس بار جان بچ گئی ہے دوسری بار نہیں بچے گی ----

لیکن وہ دوسری بار بھی چلی گئی' سیں الاہ (اللہ) خیر کرے۔ دیکھ لینا کیا ہو گا۔ میں نے سندھ سے باہر قدم نہیں نکالا' ایک بار لاہور کی اسمبلی میں گیا تھا پھر میں نے توبہ کی۔ اب دیکھو میں اپنے لوگوں میں خوش ہوں' الاہ (اللہ) کا فضل ہے اور میں ہوں! سید صاحب بڑے شفیق اور محبت کرنے والی شخصیت تھے۔ وہ اپنے اصولوں کے لیے لڑ مرنے کے لیے آمادہ رہتے تھے لیکن اصولی اختلاف کو انہوں نے کبھی ذاتی دشمنی میں تبدیل نہیں ہونے دیا۔ وہ سندھ کے ان وڈیروں میں سے تھے جو نہ صرف یہ کہ غیر ملکی استعمار سے نبرد آزما رہے بلکہ انہوں نے یا ان کے بزرگوں نے سامراج کا آلہ کار بننا کبھی پسند نہیں کیا۔ سندھ کے دوسرے وڈیرے پیران پاگارہ تھے۔ ان دونوں کے علاوہ دور دور تک کوئی بھی مرد حر نہیں دکھائی دیتا لیکن ان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ عجیب و غریب ہے۔ پیر صاحب پاگارہ کے والد تخت سے تختہ دار تک پہنچے اور جناب جی ایم سید کے والد مقتول ہوئے۔ خود سید صاحب بھی نیند کی حالت میں موت کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ان کی زندگی جد وجہد میں گذری ع تنہا پس زنداں کبھی رسوا سر بازار لیکن ع ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت کی بچی تصویر--- ایک بار میں نے بڑے ادب سے سوال کیا!

سائیں۔ آپ تحریک پاکستان کے صف اول کے سالار تھے' عین اس وقت آپ اس قافلے سے کیوں علیحدہ ہوئے جب منزل مراد قریب تر تھی؟

سید صاحب مسکرائے اور کہنے لگے! "میں نے منزل کی کبھی پرواہ نہیں کی کیونکہ منزل کا مطلب موت ہے اور زندگی کا نام جدوجہد ہے' یہی وجہ ہے کہ جب منزل قریب دکھائی دینے لگتی ہے تو میں راستہ بدل لیتا ہوں---"

سید صاحب سے ایک بار نہیں کئی بار ملاقاتیں ہوئیں' انتہائی خوشگوار ماحول میں بھی اور انتہائی کشیدگی کی کیفیت میں بھی' لیکن دونوں حالتوں میں وہ اپنے جذبات پر قابو پانے میں کامیاب دکھائی دیئے۔ وہ سندھ کی زمین سے محبت کا دم بھرتے تھے لیکن وہ پاکستان سے بھی برگشتہ نہیں ہوئے تھے' جب تک مشرقی پاکستان ساتھ تھا ان کی زبان بھی تلخ نہیں تھی۔ لیکن مشرقی پاکستان کی روانگی کے بعد انہوں نے سندھو دیش کا نعرہ بلند کیا۔ یہ ایک احتجاجی نعرہ تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ۱۹۴۷ میں ترک وطن کر کے آنے والے حضرات بھی ان کے ساتھ مل جائیں' انہوں نے اس مقصد کے لئے اردو بولنے والے حضرات کے لئے حیدر منزل اور اپنے دل کے دروازے کھول دئے لیکن ان دروازوں کو بہت کم لوگ عبور کر پائے کیونکہ اس دہلیز تک پہنچنے کے لئے پل صراط سے گذرنا پڑتا تھا' اردو بولنے والوں میں خلیل احمد شاندی مرحوم' اختر رضوی' علامہ علی مختار رضوی اور احسن رضوی ان سے بہت قریب تھے۔ اور اب یہ قربت کا رشتہ سید صاحب کے صاحبزادے سید امداد محمد شاہ کی طرف منتقل ہوا ہے کہ وہ اپنی بیماری کے باوجود اپنے والد کی طرح خوش مزاج ہیں' خوش گفتار ہیں اور دوستی نبھانا بخوبی جانتے ہیں۔ ان کے مزاج میں کوئی بدبو نہیں۔ میں ممتاز علی بھٹو کا بھی قدردان ہوں۔ وہ اپنے کزن ذوالفقار علی بھٹو سے زیادہ ذہین ہیں لیکن ان کی طرح چرب زبان نہیں' وہ ہر حال میں سچ اور کھری بات کہتے ہیں اور لگی لپٹی رکھے بغیر جو کچھ دل میں ہوتا ہے وہی ان کی زبان پر ہوتا ہے' وہ بھی مذاکرات پر یقین رکھتے ہیں اور وعدے کی پابندی کرنا جانتے ہیں۔ اسی طرح مہاجر قیادت میں بھی باشعور اور متحمل مزاج لیڈروں کی کمی نہیں'

الطاف حسین سے لے کر آفاق شاہد تک اور جناب اشتیاق اظہر سے پروفیسر عبدالغفور احمد تک سوچنے اور سمجھنے والے موجود ہیں' الطاف میں اگر کوئی تلخی تھی تو وہ دور ہو چکی ہے گذشتہ پانچ سال سے وہ جس طرح حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اب سیاست دان ہی نہیں بلکہ مدبر بن چکے ہیں۔ ایسے کئی مرحلے آئے تھے جب وہ سندھ کے شہری علاقوں میں محاذ آرائی کی آگ کو آتش فشاں میں بدل سکتے تھے۔ اسی طرح ڈاکٹر فاروق عبدالستار اور ان کے دیگر ساتھی سوچ سمجھ کر بات کرتے ہیں۔

سندھ کے آتش فشاں مسائل کو حل کرنے کے لئے یہ مثبت عوامل موجود ہیں لیکن ان کے ساتھ ہی منفی عوامل بھی موجود ہیں اور بدقسمتی سے ان کا تعلق حکمران جماعت سے ہے۔ سندھ اسمبلی میں پی پی کے ارکان اسمبلی کا ایک گروپ اس بات کا دعویدار ہے کہ اس کا سلسلہ نسب راجہ داہر سے جا ملتا ہے اور وہ اس بات پر برملا فخر کرتے ہیں۔ وزیر اعلیٰ عبداللہ شاہ اور ان کی کابینہ کے بیشتر ارکان بجھتی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ بعض سرکاری ایجنسیوں نے بھی اس معاملے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ جنرل نصیر اختر ہوں یا بریگیڈیئر آصف ہارون' انہوں نے سندھ کے شہری علاقوں میں اپنے لئے عزت و احترام کے جذبات سرد کئے ہیں اور شاید اسی لئے ان میں سے ایک کو فوری طور پر اور دوسرے کو ذرا تاخیر سے وہاں سے ہٹا لیا گیا۔ وزیر داخلہ سندھ کے موجودہ لاٹ صاحب اور پروفیسر این ڈی خان نے اپنی ساکھ گنوا دی ہے اور لوگ ان کے قول پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وزیر اعظم خواہ کتنے ہی پیکج کا اعلان کریں اس سے سندھ کے حالات ہرگز بہتر نہیں ہوں گے ---- اس کے لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں کو حق حکمرانی دیا جائے جن پر عوام کو اعتماد ہو ---- اس مقصد کے لئے سنجیدہ اور محب الوطن افراد کے درمیان اس مضمون کے پہلے پیراگراف میں جن خدشات کا اظہار کیا گیا ہے انہیں دور کرنے کے لئے بامقصد مذاکرات کا اہتمام ضروری ہے' حالات پر ہماری گرفت کمزور ہوتے جا رہی ہے' خلیج میں نئے حالات کے باعث بحران کے مزید سنگین ہونے کے امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے سندھ کے مثبت اور منفی رویوں کی نشان دہی کر دی ہے اب جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

بقیہ : حدیث امروز

جنہوں نے جہاد افغانستان کو نسلی امتیاز کی بھینٹ چڑھ جانے سے بچا لینے کا فیصلہ کیا اور جنہوں نے غیور افغانوں کے دیس میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا مصمم ارادہ کرتے ہوئے نعرۂ تکبیر بلند کر دیا۔ اگرچہ آتشیں اسلحہ افغانوں کے ہاں کھلونے کی طرح جانا پہچانا جاتا ہے تاہم ایک تجربہ کار دشمن کے خلاف جنگ لڑنے کے لئے جس قدر ٹریننگ از بس ضروری ہوتی ہے وہ پوری طرح ان طالبان حق کو میسر نہ تھی۔ اس کے باوجود یہ مردان باصفا عزم و ہمت لئے' اللہ پر توکل کئے نکل کھڑے ہوئے اور جس سرعت سے کامیابیاں ان کے قدم چومتے چلی گئیں اس نے لوگوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اسی لئے تو چہ مہ گوئیوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی نے شور مچایا کہ امریکہ ان کی پیٹھ ٹھونک رہا ہے' کسی نے واویلا کیا کہ پاکستان ان کی پشت پر ہے اور کسی نے کہا کہ سعودی عرب ان کا ہاتھ تھامے ہے۔ اوروں کو تو چھوڑیئے' خود مسلمان بھول گئے کہ قدرت بھی مدد کو آیا کرتی ہے۔ پھر حیرانگی کیوں؟ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے عملی قیام کی خاطر طالبان حق نے اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کی تعمیل میں فرد واحد کی اطاعت قبول کی اور بڑھتے چلے گئے۔ دارالحکومت پر قبضہ کر لینے کے بعد انہوں نے سابق صدر اور اس کے بھائی کو پھانسی دے دی' لڑکیوں کے سکول کالج وقتی طور پر بند کر دیئے اور عورتوں کو گھروں سے باہر ملازمت پہ جانے سے روک دیا۔ بس شور مچ گیا۔ افسوس کہ خود مسلمانوں نے ان فیصلوں پر سخت نکتہ چینی کی اور کر رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا "خون کا بدلہ لینے میں تمہاری زندگی ہے' اے عقلمندو"۔ اور اس حقیقت سے کوئی ذی ہوش کیسے انکار کر سکتا ہے کہ دنیا کی بیشتر خرابیوں کی وجہ مرد و عورت کی بے پردہ مخلوط زندگی ہے۔ صد حیف ان مسلمانوں پہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق پردے کے بارے میں مردان حق کی طرف سے لگائی گئی پابندی کو اسلام کی بدنامی کا باعث قرار دیا۔ اللہ سے معافی چاہو اور دعا کرو اللہ تعالیٰ انہیں اپنے مشن پر کاربند رہنے کی توفیق عطا فرمائے' انہیں اندرونی خلفشار سے بچے رہنے کی عقل نصیب ہو اور یہ کہ طالبان حق کی جدوجہد کرۂ ارض پر دین اسلام کے مکمل نفاذ کے آخری مرحلے کا نقطہ آغاز ثابت ہو۔ آمین○○

1924ء میں خلافت کی تنسیخ کے بعد سے 1969ء تک
عالم اسلام کے کسی متحد نظام یا ادارہ کے قیام کی مساعی کے جائزہ پر مشتمل ایک تاریخی دستاویز جو گوشہ خلافت کے عنوان سے ندائے خلافت میں بالاقساط شائع کی جاتی رہی

استنبول سے رباط تک

تالیف :
عمران این حسین

ترجمہ و تلخیص از محمد سردار اعوان

تقدیم از قلم ڈاکٹر اسرار احمد

سفید کاغذ' صفحات : 110' قیمت : 30 روپے

شائع کردہ : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

صدر اور وزیر اعظم بھی اپنے حلف کی رو سے کسی غیر اسلامی حکم پر عمل نہیں کر سکتے !

جج اگر مخلص ہو تو وہ میسر آئینی شقوں سے بھی اپنے پسندیدہ نتائج اخذ کر سکتا ہے

جو لوگ اپنی مسند پر بیٹھ کر ناانصاف رہے وہ معاشرے کو کیسے انصاف دے سکتے ہیں !

عدالت عظمیٰ اور شریعت کورٹ کے درمیان متوقع تاریخی جنگ مصلحت اور مصالحت کی نذر ہو گئی

عدالت عظمیٰ نے ۲۰ مارچ کو وہاب الخیری کے مقدمے میں جو فیصلہ دیا اس کے بعد انتظامیہ اور عدلیہ کی کشمکش تاریخ میں پہلی بار اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی' بے نظیر حکومت اس فیصلے کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی اور فیصلے کو معطل اور بے اثر کرنے کے لئے مختلف سمتوں میں مختلف حکمت عملی طے کی گئی یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ اس فیصلے کا اطلاق سجاد علی شاہ پر کیا جائے حکومت کا یہ فیصلہ بالکل درست تھا اور اسے فی الفور نافذ العمل ہو جانا چاہئے تھا مگر بے نظیر بھٹو سخت غصے اور اشتعال کے باوجود اس انتہا تک نہ جا سکیں بات صرف یہ تھی کہ سجاد علی شاہ کے جانے کے بعد جسٹس اجمل چیف جسٹس بنتے اور اور جسٹس اجمل کا کردار نہایت اجلا تھا وہ نہایت جرئی ایماندار اور بے خوف جج ہیں اور اگر وہ چیف جسٹس بن جاتے تو شاید اس ملک کی تاریخ عدالتی انقلاب کے عظیم الشان عمل سے گزر سکتی وہ مقدمات کو دبانے' تعلقات بنانے' مفادات کو سمیٹنے' ٹالنے اور وقت گزارنے کے قائل نہیں اور ہماری عدالتی تاریخ میں اتنی برق رفتاری کے ساتھ مقدمات سننے اور ان پر فوراً فیصلے کرنے کے معاملے میں کوئی جج ان کا ہمسر نہیں ہے' وہ کسی کے دباؤ میں آنے والے جج بھی نہیں تھے' لہٰذا ان سے کسی نازک موقع پر مفاہمت کا ذرہ بھر امکان بھی موجود نہ تھا' لہٰذا اپنے وسیع تر مفاد میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ جسٹس سجاد علی شاہ کا وجود برداشت کیا جائے اور فی الحال مفاہمت کی راہ اختیار کی جائے اس مفاہمت کے بعد ہی دونوں جانب سے کھلے عام جنگ بندی کا اعلان کیا گیا اور عدالتوں کے جج از خود مستعفی' ہونے لگے اس مفاہمت کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو نے سجاد علی شاہ سے فون پر براہ راست رابطہ قائم کیا انہیں فیصلے پر عمل درآمد کی یقین دہانی کرائی تاہم وزیر اعظم نے چیف جسٹس کو بتایا کہ پانچ فارغ شدہ ججوں کا موقف ہے کہ عدالت عظمیٰ نے ان کے بارے میں جن تحفظات کا اظہار کیا ہے اس حوالے سے چیف جسٹس انہیں شنوائی اور اپنا موقف پیش کرنے کا ایک موقع دیں تو یہ انصاف کے بنیادی تقاضوں کے عین مطابق ہو گا اس رابطے کے بعد چیف جسٹس نے وزیر اعظم سے کہا کہ وہ ایران سے واپسی پر پانچ جج حضرات کی معروضات پر غور کریں گے ہماری دانست میں یہ رابطہ بھی مناسب نہیں ہے اور صرف پانچ جج حضرات کو وزیر اعظم کی سفارش پر معروضات پیش کرنے کا موقع دینا آئین کی شق ۲۵ کی خلاف ورزی ہے عدالت عظمیٰ کا فیصلہ واضح اور دو ٹوک ہے اس میں کسی مفاہمت اور مصالحت کی گنجائش نہیں ہے اور اگر کوئی گنجائش پیدا کی جا سکتی تھی تو وہ گنجائش از خود پیدا کی جاتی وزیر اعظم کی مداخلت پر نرم رویئے کا اظہار عدلیہ پر انتظامیہ کی خوشگوار بالادستی کا پہلا مظاہرہ ہے اور ضروری نہیں کہ آخری بھی ہو۔ قبل ازیں وزیر اعظم نے عدالت عظمیٰ کے فیصلے کو شریعت عدالت کے ذریعے غیر اسلامی قرار دینے اور شریعت عدالت کو عدالت عظمیٰ پر بالادست قرار دینے کے ایک منصوبے پر کام شروع کر دیا تھا وجہ یہ تھی کہ عدالت عظمیٰ کے تفصیلی فیصلے میں شریعت عدالت میں ججوں کی تقرری کے معاملے کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ آئین کے تحت شریعت عدالت کے چیف جسٹس اور ججوں کی تقرری کے لئے صدر چیف جسٹس کے مشورے کا پابند نہیں اور شریعت عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل کی سماعت کرنے والی سپریم کورٹ اپیلیٹ بنچ کے تین ارکان کا تقرر بھی صدر کی صوابدید پر منحصر ہے لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ شریعت کورٹ میں اپنی مرضی کے جج نامزد کئے جائیں اور شریعت اپیلیٹ بنچ بھی اپنی مرضی سے تشکیل دیا جائے اور شریعت عدالت سے فیصلہ لے کر سپریم کورٹ شریعت اپیلیٹ بینچ سے اس فیصلے کی توثیق کرا کے شریعت عدالت کو عدالت عظمیٰ پر بالادست قرار دے دیا جائے پہلے مرحلے کے طور پر فیڈرل شریعت کورٹ کے چیف جسٹس نے ایک صحافی شاہد اورک زائی کی درخواست اس نکتے پر سماعت کے لئے منظور کر لی کہ شریعت کورٹ کا دائرہ اختیار محدود

> "پاکستان کا آئین دنیا کا واحد آئین ہے جہاں ہر شخص اپنے مزاج کے مطابق آئینی شقیں ڈھونڈ سکتا ہے اور ہر نقطہ نظر کی ترجمانی اسی آئین سے کی جا سکتی ہے ایک مسلمان اس سے اسلامی ریاست کے خدوخال ابھار سکتا ہے اور ایک لادین شخص ایک مکمل لادینی ریاست کے تمام برگ و بار اسی شجر سے حاصل کر سکتا ہے ایسے دستور کو اسلامی' لادینی' کچھ بھی کہا جا سکتا ہے اور اتفاق یہ ہے کہ اس پر تمام دینی و لادینی قوتوں کا اتفاق ہے"

نہیں اسی دوران عدالت عظمیٰ نے شریعت عدالت کے جج جسٹس شفیع محمدی سے توہین عدالت کے ضمن میں وضاحت طلب کر لی اور انہیں ذاتی طور پر عدالت میں پیش ہونے کا حکم دیا جس کے بعد شریعت عدالت اور عدالت عظمیٰ کے اختیارات کے حوالے سے اخبارات میں ایک دلچسپ بحث چھڑ گئی' حیرت

انگیز بات یہ تھی کہ شفیع محمدی اپنے بیانات کے ذریعے عدالت عظمیٰ اور چیف جسٹس کو بے پناہ تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے اور عدالت عظمیٰ کے خلاف توہین عدالت کے حکم نامے کے اجراء کا سرعام عندیہ دے رہے تھے انہیں سرکار کی مکمل حمایت حاصل تھی اور ان کے بیانات کے ذریعے عدالت عظمیٰ کو سبق سکھایا جا رہا تھا کہ وہ اپنی تیز گامی ترک کر دے جس آئین سے اس نے طاقت کشید کی ہے وہی آئین اس کے طاقت کے سرچشمے کو لمحوں میں شریعت کی بالادستی کے نام پر خشک کر دے گا پاکستان کا آئین دنیا کا واحد آئین ہے جہاں ہر شخص اپنے مزاج کے مطابق آئینی شقیں ڈھونڈ سکتا ہے اور ہر نقطہ نظر کی ترجمانی اسی آئین سے کی جا سکتی ہے ایک مسلمان اس سے اسلامی ریاست کے خدوخال ابھار سکتا ہے اور ایک لادین شخص ایک مکمل لادینی ریاست کے تمام برگ و بار اسی شجر سے حاصل کر سکتا ہے ایسے دستور کو اسلامی' لادینی' کچھ بھی کہا جا سکتا ہے اور،

اتفاق یہ ہے کہ اس پر تمام دینی و لادینی قوتوں کا اتفاق ہے جسٹس شفیع محمدی نے اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا کہ شریعت کورٹ کا کام شریعت کی بالادستی ہے جبکہ سپریم کورٹ شریعت کے بجائے آئین کی پابند ہے آئین میں ۱۶ حلف ہیں اور شریعت کورٹ کے جج کے حلف میں آئین کا لفظ نہیں ہے' اسی طرح صدر اور وزیر اعظم کے حلف میں قرآن و سنت کا ذکر ہے جبکہ باقی عہدوں کے حلف میں آئین کا لفظ ہے یوں صدر اور وزیر اعظم بھی کسی غیر اسلامی حکم پر عمل نہیں کر سکتے اگر شریعت کورٹ کو سپریم کورٹ کے تابع کر دیا جائے تو وہ شریعت کے مطابق نہیں ہو گا کیونکہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج غیر مسلم بھی ہو سکتے ہیں جسٹس شفیع محمدی کے بیان کا صاف مقصد عدالت عظمیٰ کو باور کرانا تھا کہ شریعت عدالت' صدر اور وزیر اعظم شریعت کے پابند ہیں جبکہ تمام ادارے بشمول عدالت عظمیٰ آئین کے پابند ہیں اور شریعت بہرحال آئین سے بالاتر ہے لہٰذا عدالت عظمیٰ کے فیصلے کو صدر اور وزیر اعظم رد کر سکتے ہیں اگر وہ اسلام کے منافی ہو اور اس بات کی تشریح کہ کونسی چیز اسلام ہے یا خلاف اسلام شریعت عدالت کا دائرہ کار ہے اور شریعت عدالت صدر مملکت کے رحم و کرم پر ہے لہٰذا شریعت عدالت سے ٹکرانے کی کوشش نہ کی جائے ہم نے پچھلے اداریے میں لکھا تھا کہ عدالت عظمیٰ کا فیصلہ جامع نہیں ہے اور اس ضمن میں مزید تفصیلی فیصلے کی ضرورت ہے' ہمارا اشارہ دراصل اسی جانب تھا عدالت عظمیٰ کا فرض تھا کہ وہ شریعت عدالت اور شریعت اپیلیٹ بنچ سپریم کورٹ میں ججوں کی تقرری کے اختیار کو بھی اپنے دائرے میں شامل کرتی اور یہ قدغن بھی عائد کرتی کہ کسی ریٹائرڈ جج کو شریعت عدالت میں جج نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ روزگار کے طلب گار ملازمت کا تحفظ نہ پا کر غلط فیصلے بھی کر سکتے ہیں۔

> "معاشرے کے مخلص اور ایمان دار لوگ ضیاء الحق کے ہاتھوں یرغمال بنے اور جب اس قید سے رہا ہوئے تو معلوم ہوا کہ نہ شریعت باقی ہے نہ آئین کا حلیہ برقرار ہے' نہ عدالتوں کی حرمت باقی ہے نہ بنیادی حقوق کا تحفظ قائم ہے"

شریعت عدالت میں ججوں کی تقرری کے لئے نئے ضابطے اور قواعد کی ضرورت تھی مگر عدالت عظمیٰ جلد بازی میں یہ پہلو پیش نظر نہ رکھ سکی اور یوں ایک سنگین آئینی بحران کا راستہ ہموار ہو گیا۔ جسٹس شفیع محمدی کی گستاخی اس حد تک بڑھی کہ انہوں نے عدالت عظمیٰ میں ان کے بارے میں ادا کئے گئے کلمات پر شدید ردعمل ظاہر کرتے ہوئے اخباری بیان کے ذریعے دھمکی دے دی کہ وہ شریعت عدالت کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کئے جانے کے خلاف کارروائی کا جائزہ لے رہے ہیں۔

عدالت عظمیٰ میں توہین عدالت کے مقدمے میں ممتاز وکیل راجہ اکرم نے کہا کہ "شفیع محمدی توہین عدالت کے سنگین اقدام کے مرتکب ہوئے ہیں لہٰذا اس طالع آزما کے ساتھ آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے اگر ذرا بھی نرمی کی گئی تو عدالتی نظام تباہ ہو جائے گا' پوری بار اور قوم کی رائے ہے کہ ذرا بھی تاخیر نہ کی جائے ایک ہفتے میں مقدمے کا فیصلہ کیا جائے شفیع محمدی آئین شکن ہیں ان سے آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے جب کوئی شر انگیز عدلیہ کا نقاب اوڑھ لے تو زیادہ خطرناک ہے"۔

شفیع محمدی نے سپریم کورٹ کے اختیارات کو للکارا ہے' پارلیمانی جمہوریت پر حملہ کیا ہے' عدلیہ کا وقار کم کیا ہے۔ وہ یہ تاثر دے رہے ہیں کہ وہ سب کچھ ہیں وہ نہ آئین کے تابع ہیں نہ سپریم کورٹ کے پابند ہیں ان کا یہ موقف براہ راست آئین سے متصادم ہے۔

راجہ اکرم کے دلائل پر شفیع محمدی نے پھر بیان جاری کیا اور کہا کہ شریعت عدالت کی توہین برداشت نہیں کروں گا اگر شریعت عدالت کے جج کے خلاف واقعی توہین آمیز زبان استعمال کی گئی ہے تو وہ اس کا نوٹس لیں گے۔

عدالت عظمیٰ اور شریعت عدالت کے مابین برپا یہ جنگ اگر اخبارات کے بجائے عدالت میں لڑی جاتی تو ایک نئی تاریخ رقم ہوتی کیا شریعت بالادست ہے یا آئین بالادست ہے کیا آئین کو شریعت پر مقدم رکھا جا سکتا ہے یہ بحثیں پرانی سہی مگر اب ان کا رنگ اور تھا مگر عدالت عظمیٰ اور شریعت عدالت کے درمیان متوقع تاریخی جنگ مصلحت اور مصالحت کی نذر ہو گئی' جنرل ضیاء الحق کے عہد حکومت میں دستور کے دیباچہ قرارداد مقاصد کی شق ۲ اے کے تحت اضافے نے عدالتوں میں ایک نئی بحث کو جنم دیا کہ کیا شق ۲ اے کے تحت شریعت بالادست ہو گئی ہے یا آئین زیردست رہ گیا ہے۔ اس ضمن میں

> "اگر دیانتداری' امانت داری' جرات' حوصلے اور بے لوثی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو بدتر سے بدترین آئین بھی بہترین معاشرے کی تشکیل کا ذریعہ بن سکتا ہے مگر جہاں لوگ کرسی سے محبت کرتے ہوں اور ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی اعلیٰ ترین عہدوں کے طلبگار رہتے ہوں وہاں بہتر سے بہتر آئین بھی مثبت نتائج نہیں دے سکتا"

لاہور ہائی کورٹ کے جج جسٹس افضل ظلہ نے جو بعد میں چیف جسٹس کے منصب پر فائز ہوئے ایک تاریخی فیصلہ دیا اور شق ۲ اے کو Supra Constitution قرار دیا اس فیصلے کے بعد سندھ ہائی کورٹ کے جج جسٹس وجیہ الدین احمد اور ڈاکٹر تنزیل الرحمن نے شق ۲ اے کو آئین کی تمام شقوں پر مقدم قرار دیا لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ جب جسٹس افضل ظلہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن شریعت عدالت کے چیف جسٹس مقرر کئے گئے تب انہیں اپنے سابقہ فیصلے یاد نہ آئے اور وہ اس ضمن میں کوئی تاریخی پیش رفت نہ کر سکے بلکہ مصلحت اور حکمت کے ہاتھوں مغلوب ہو گئے حاکم خان کیس ایک اہم کیس تھا مگر جسٹس ظلہ نے اس کی سماعت نہ کی اور جب جسٹس نسیم حسن شاہ کے عہد میں اس مقدمے کی سماعت کی گئی تو نسیم حسن شاہ نے اپنے فیصلے کے ذریعے شق ۲ اے کو آئین پر مقدم قرار دینے سے انکار کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ اس سے پورا آئین بدل جائے گا اور نیا آئین تحریر کرنا پڑے گا نسیم حسن شاہ وہ جج تھے جو اس ملک میں شریعت کے نفاذ کے بڑے موثر وکیل رہے ہیں بات صرف یہ ہے کہ کوئی جج مخلص ہو تو وہ میسر آئینی شقوں سے بھی اپنے پسندیدہ نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ عدالت عظمیٰ آئین کی آخری شارح ہے اور اس اختیار کو اگر دیانتداری امانتداری جرات حوصلے اور بے لوثی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو بدتر سے بدترین آئین بھی بہترین معاشرے کی تشکیل کا ذریعہ بن سکتا ہے مگر جہاں لوگ کرسی سے محبت کرتے ہوں اور ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی اعلیٰ ترین عہدوں کے طلبگار رہتے ہوں وہاں بہتر سے بہتر آئین بھی مثبت نتائج نہیں دے سکتا۔ جسٹس افضل ظلہ اگر مخلص ہوتے اور لاہور ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے دیئے گئے فیصلے پر شرح صدر سے قائم رہتے تو وہ چیف جسٹس بن کر شریعت کو آئین پر مقدم قرار دے سکتے تھے لیکن جن لوگوں کی زندگی شریعت کی روح سے خالی ہو وہ شریعت کو اپنے اداروں اور حیات اجتماعی پر کبھی بھی عملاً غالب نہیں ہونے دیں گے عدالتوں کے ذریعے اسلامی نظام کے نفاذ کی بحث ضیاء الحق کی پیدا کردہ بحث تھی اس بحث کے نتیجے میں معاشرے کے مخلص اور ایماندار لوگ ضیاء الحق کے ہاتھوں یرغمال بنے اور جب اس قید سے رہا ہوئے تو معلوم ہوا کہ نہ شریعت باقی ہے نہ آئین کا حلیہ برقرار ہے' نہ عدالتوں کی حرمت باقی ہے نہ بنیادی حقوق کا تحفظ قائم ہے۔ جسٹس افضل ظلہ اور جسٹس نسیم حسن شاہ جیسے لوگ تاریخ بدل نہیں سکتے جو لوگ اپنی مسند پر بیٹھ کر ناانصاف رہے ہوں وہ معاشرے کو کیسے انصاف دے سکتے ہیں' نسیم حسن شاہ نے خود اعتراف کیا ہے کہ "بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں جب صدر غلام اسحاق خان دو مقدمات میں مشکل میں تھے تو میں نے ان کی مدد کی تھی میرے صدر اسحاق سے بہت اچھے تعلقات تھے" ایسے جانبدار شخص کو چیف جسٹس کے عہدے کے بجائے کسی دربار میں فیضی کا رتبہ سنبھالنا چاہئے۔

یہ بھی تاریخی واقعہ ہے کہ جسٹس نسیم شاہ نے جھوٹا حلف نامہ داخل کر کے حکومت سندھ سے رہائش کے لئے کلفٹن میں پلاٹ لیا اور چند ہفتوں کے بعد اسے گراں قیمت پر بیچ دیا گیا۔ ڈان کے کالم نگار نے اس پر کالم لکھا تو توہین عدالت کا نوٹس جاری ہوا مقدمے کی سماعت بند کمرے میں ہوئی اور چیف جسٹس نے عزت اسی میں سمجھی کے نوٹس واپس لے لیا جب جسٹس افضل ظلہ چیف جسٹس تھے تو انہیں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا ریکٹر مقرر کیا گیا۔ اس وقت یونیورسٹی میں ملازمین کی انجمن کی ہڑتال جاری تھی عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد ان کے نمائندے نے عہدیداران انجمن سے بات کی اور تمام مطالبات تسلیم کرنے کی یقین دہانی کے ساتھ ہی ہڑتال ختم کرنے کا بھی مطالبہ کیا اور ہڑتال ختم کر دی گئی دوسرے دن انجمن کے تمام عہدیداران کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا' جبکہ چیف جسٹس افضل ظلہ ایک مقدمے میں خود یہ فیصلہ دے چکے تھے کہ کسی ملازم کو سماعت کے موقع دیئے بغیر برطرف کرنا اسلام کے عطا کردہ حقوق کی نفی ہے انجمن کے عہدیداروں نے راولپنڈی بنچ میں فیصلے کے خلاف درخواست داخل کی تو جج نے سماعت سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں چیف جسٹس کے خلاف مقدمہ سن کر کسی دور دراز کے علاقہ میں اپنا تبادلہ نہیں چاہتا' ملازمین لاہور گئے مگر کہیں مقدمے کو سننے کے لئے کوئی جج تیار نہ تھا واپس جسٹس ظلہ کے دربار ملوکیت میں حاضر ہوئے انہوں نے اپنے چیمبر میں طلب کیا عدالت کا وقت ختم ہونے کے بعد کھلی عدالت میں ملازمین کا مقدمہ سنا اور انہیں ترقیاں دے کر افسر بنا دیا اور ملازمتوں پر بحال کر دیا اس کے ساتھ ہی یونین کا خاتمہ ہو گیا جس ملک میں ایسے لوگ چیف جسٹس بنائے جائیں اور اخبار نویس ایسے لوگوں کے قصیدے لکھیں اس ملک میں انصاف کا بول بالا کیونکر ہو گا۔ (ماہنامہ "ساحل" کراچی)

خلافت کی اصل حقیقت اور اس کا تاریخی پس منظر
اور عہد حاضر میں اس کے دستوری و قانونی اور معاشی و معاشرتی ڈھانچے اور اس کے
قیام کے لئے سیرت نبویؐ سے ماخوذ طریق کار کی تشریح پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد

داعی تحریک خلافت پاکستان
کے چار جامع خطبات کا مجموعہ' بعنوان :

خطبات خلافت

سفید کاغذ' صفحات : 212' قیمت : 50 روپے

شائع کردہ : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارہ ثقافت اسلامیہ مالی بحران کا شکار ہوا نہیں' کر دیا گیا ہے

اب صورتحال یہ ہے کہ ادارہ میں نہ کوئی لکھنے والا رہا ہے اور نہ کسی موضوع پر ریسرچ کرنے والا

بارہ لاکھ روپے سالانہ گرانٹ حاصل کرنے والے ادارہ نے گزشتہ چار سال سے کے عرصے میں کوئی کتاب شائع نہیں کی

۱۹ / اپریل ۱۹۹۶ء کے "نوائے وقت" میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر رشید احمد جالندھری کے حوالے سے ایک خبر شائع ہوئی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ مالی بحران کا شکار ہو گیا ہے۔ لہٰذا ادارے کے پانچ شعبے ختم کر دیئے گئے ہیں جن میں ریسرچ کا شعبہ' سکرپٹ ایڈیٹنگ کا شعبہ اور سیکرٹری یعنی انتظامیہ کا شعبہ شامل ہیں۔

یہاں نہایت اختصار کے ساتھ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بارے میں چند گزارشات پیش کی جاتی ہیں تاکہ کسی حد تک حقیقت حال واضح ہو جائے اور لوگوں کو پتہ چل جائے کہ ریسرچ کا اتنا بڑا ادارہ پہلے کیا تھا اور اب کن حالات سے گزر رہا ہے اور کیوں گزر رہا ہے۔ یہ ایک قومی مسئلہ ہے اس لئے کہ حکومت اب تک اس پر کروڑوں روپے خرچ کر چکی ہے اور کر رہی ہے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ فروری ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے قائم کیا تھا اور وہی اس کے پہلے ڈائریکٹر تھے جس جگہ (۲ کلب روڈ پر) یہ ادارہ قائم ہے' اس وقت کی حکومت پاکستان نے یہ جگہ خلیفہ صاحب کو ان کی ذاتی رہائش کے لئے الاٹ کرنے کی پیشکش کی تھی لیکن انہوں نے تجویز پیش کی کہ یہاں ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے حکومت کو اس کے اغراض و مقاصد پیش کئے اور اس طرح یہ ادارہ قائم ہو گیا۔ اس مادی دور میں خلیفہ صاحب کی یہ بہت بڑی قربانی تھی۔ انہوں نے ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو وفات پائی۔ ان کے بعد علی الترتیب ایم ایم شریف' ایس ایم اکرام' پروفیسر محمد سعید شیخ' سراج منیر اور محمد سہیل عمر اس کے اکیڈمک ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ان حضرات کے زمانے میں مولانا محمد حنیف ندوی' ڈاکٹر رفیع الدین' مظہر الدین صدیقی' شاہ محمد جعفر پھلواری محمد اسحاق بھٹی' محمد سرور جامعی' شاہد حسین رزاقی اور بعض دیگر اہل علم ریسرچ سکالر کے طور پر ادارے میں خدمات سرانجام دیتے رہے اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ نہایت کامیابی کے ساتھ جاری رہا' ان میں سے ہر ایک نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ خود ادارے کے ڈائریکٹروں نے انگریزی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھیں جو ادارے کی طرف سے شائع ہوئیں۔ یہ کتابیں قرآن' حدیث' فقہ' سیرت' تاریخ' اقتصادیات' تصوف' ادبیات' اسلامی فلسفہ اور اسلامی تہذیب و ثقافت وغیرہ موضوعات پر مشتمل ہیں اور ان کی مجموعی تعداد تین سو کے قریب ہے۔

جون ۱۹۹۲ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ ایک نئے ڈائریکٹر سے آشنا ہوا' جن کا اسم گرامی ڈاکٹر رشید احمد جالندھری ہے اور جنہوں نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے (نوائے وقت) میں یہ خبر چھپوائی کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ مالی بحران کا شکار ہو گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شکار ہوا نہیں' کر دیا گیا ہے۔

مختصر الفاظ میں اس کی تشریح یہ ہے کہ ادارے کو حکومت پنجاب کے انفارمیشن سیکرٹری کی طرف سے اور مرکز سے اکیڈمی آف لیٹرز کی وساطت سے گیارہ بارہ لاکھ روپے سالانہ گرانٹ ملتی تھی اور نہایت اچھے طریقے سے کام چل رہا تھا۔ حکومت کو سالانہ اخراجات کی صحیح رپورٹ پیش کی جاتی تھی اور جو کتابیں چھاپنے کا منصوبہ بنتا' اس کی تفصیل متعلقہ محکموں کو بھیجی جاتی تھی اور اس کے مطابق کتابیں شائع کی جاتی تھیں۔ لیکن جون ۱۹۹۲ء سے (جب سے ڈاکٹر رشید احمد جالندھری تشریف لائے ہیں) معاملہ مختلف ہے۔ گزشتہ چار سال سے کتابوں کی نشر و اشاعت کے بارے میں بالعموم صحیح صورتحال سے محکموں کو مطلع نہیں کیا جاتا۔ بعض کتابیں چھاپنے کی اطلاع ہر سال دی گئی اور ہر سال ان کے اخراجات کی رقم وصول کی گئی' لیکن کتابیں نہیں چھاپی گئیں۔

وقائع خصوصی

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری نے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لئے چار سال کے عرصے میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ البتہ چند مہینے پہلے ایک انگریزی کتاب "اسلام ان ساؤتھ ایشیا" چھپی ہے۔ یہ ان کی موضوعی کتاب نہیں ہے بلکہ مقالات کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۶ء میں ایک سیمینار میں مختلف حضرات نے اسلام آباد میں پڑھے تھے۔ وہ مقالات ڈاکٹر احمد جالندھری اور جناب افضل حق قرشی صاحب نے مرتب کر کے ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے چھاپ دیئے ہیں۔ ابتدا میں دو تین صفحے انہوں نے تحریر فرمائے ہیں۔ اس کتاب کو ڈائریکٹر موصوف اپنی کتاب قرار دے رہے ہیں' جبکہ دو حضرات نے مل کر اسے ترتیب دیا ہے اور اس طرح کی ترتیب نہایت آسانی سے ایک کلرک بھی دے سکتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے بعض حضرات سے سنا گیا ہے کہ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری نے کچھ دوستوں سے اس کتاب کے بارے میں فرمایا کہ اکیڈمی آف لیٹرز کے چیئرمین جناب فخر زمان صاحب نے اسے بہت پسند کیا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس پر ایک تعارفی تقریب کا اہتمام کیا جائے جس کے اخراجات اکیڈمی آف لیٹرز ادا کرے گی۔ یعنی جو کتاب جالندھری صاحب نے نہیں لکھی' اسے ایک تقریب میں ان کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ سبحان اللہ۔

اب معاملہ یہ ہے کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں نہ کوئی لکھنے والا رہا ہے اور نہ کسی موضوع پر کوئی ریسرچ کرنے والا ہے' نہ سکرپٹ ایڈیٹر اور مسودے مرتب کرنے والا ہے اور نہ سیکرٹری ہے جو کسی ادارے کے انتظامات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ جب صورتحال یہ ہے تو یہ تصنیف و تالیف اور ریسرچ یا تحقیق کا ادارہ کیونکر قرار پائے گا؟

ڈاکٹر صاحب دراصل یہ چاہتے ہیں کہ سب لوگ چلے جائیں اور وہ تنہا رہ جائیں۔ بس اسی قدر آمدنی ہونی چاہئے' جس سے انہیں تنخواہ ملتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادارے کی تین سو کے لگ بھگ مطبوعات میں سے اس وقت صرف ۸۰ کے قریب رہ گئی ہیں۔ وہ بھی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہیں۔

کراچی کا ایک ادارہ بی سی سی آئی جناب محمد سہیل عمر کے کہنے پر کئی سال سے ادارہ ثقافت اسلامیہ کو دو لاکھ چالیس ہزار روپے سالانہ ادا کرتا تھا۔ اس نے اکتوبر ۱۹۹۵ء میں ڈائریکٹر صاحب کو خط لکھا کہ آپ اپنے ادارے کی سالانہ کارگزاری کی فوری طور پر رپورٹ بھیجیں تاکہ ہم آئندہ کے لئے آپ کی امداد جاری رکھ سکیں۔ لیکن ڈائریکٹر صاحب نے یہ خط دبائے رکھا اور چار مہینے کے بعد جنوری ۱۹۹۶ء کے آخر میں متعلقہ لوگوں کو دیا کہ اس کی تعمیل کی جائے۔ رپورٹ بھیجنے میں اس غیر معمولی تاخیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے امداد بند کر دی۔ مذکورہ بالا گزارشات کا مطلب یہ ہے کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ مالی بحران کا شکار ہوا نہیں بلکہ اسے مالی بحران کا شکار کر دیا گیا ہے۔

۱۹۹۵ء کے جولائی اور اگست میں ہفت روزہ "زندگی" ہفت روزہ "آج کل" (لاہور) روزنامہ "جسارت" (کراچی) اور فرنٹیر پوسٹ" میں متعدد مضامین شائع ہوئے۔ لیکن حکومت نے ان مضامین کی روشنی میں ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کے متعلق کوئی موثر کارروائی نہیں کی۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ کا ماہانہ رسالہ "المعارف" تقریباً تیس سال سے جاری ہے' اس وقت سے باقاعدگی سے ہر مہینے چھپتا تھا' اس کی اشاعت بارہ تیرہ سو تھی' جسے اس قسم کے رسالے کی بہت بڑی اشاعت کہنا چاہئے' لیکن اب اس کے خریداروں کی تعداد صرف پینتیس رہ گئی ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس قسم کے مضامین مختلف رسالوں سے نقل کر کے اس میں چھاپ رہے ہیں' ان سے لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ مضامین تو ان رسالوں میں پڑھ لیتے ہیں اس پر پیسے خرچ کرنے کی انہیں کیا ضرورت ہے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ کے قیام کے وقت جناب واجد علی شاہ کو اس کا چیئرمین بنایا گیا تھا۔ اب بھی وہ اس کے چیئرمین ہیں اور ان کے صاحبزادے سید شاہد علی شاہ وائس چیئرمین ہیں۔ یہ دونوں حضرات بہت بڑے کاروباری ہیں۔ شاید ان کے پاس ادارے کے معاملات پر غور کرنے کے لئے وقت نہیں ہو گا۔ اسی لئے انہوں نے عملاً تمام اختیارات ڈاکٹر محمد افضل صاحب کے سپرد کر رکھے ہیں جو ضیاء الحق کے زمانہ اقتدار میں وفاقی وزیر تعلیم تھے اور سنا ہے کہ ان کے قریبی رشتے دار بھی ہیں۔ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری اور ڈاکٹر محمد افضل آپس میں بے تکلف دوست بھی ہیں' ہم وطن بھی ہیں اور ہم برادری بھی۔ ڈاکٹر افضل کے کہنے سے ہی رشید احمد صاحب کو ادارے کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ حالانکہ انہیں نشرواشاعت کتب اور کسی علمی اور تحقیقی ادارے کو چلانے کا ہرگز کوئی تجربہ نہیں ہے۔

آخر میں ایک بات اور لندن سے ایک رسالہ "اسلامک ریویو" شائع ہوتا ہے جو مرزائیوں کا رسالہ ہے۔ اس کا جنوری ۱۹۶۹ء کا شمارہ اس وقت پیش نگاہ ہے' ان دنوں ڈاکٹر رشید احمد جالندھری لندن میں قیام فرما تھے۔ اس کے صفحہ اول پر تین ایڈیٹروں کے نام لکھے ہیں اور وہ ہیں عبدالماجد' ڈاکٹر رشید احمد جالندھری اور ڈاکٹر علی محمد خاں۔ ڈاکٹر رشید احمد اپنے نام کے بعد جالندھری کا لفظ بریکٹ میں لکھا کرتے ہیں۔ یہاں بھی یہ لفظ بریکٹ میں مرقوم ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ رسالے کے مالکوں یا اصحاب انتظام کو خود ہی انہوں نے اپنا نام لکھ کر دیا ہے۔

کسی مذہب کے اخبار یا رسالے میں مضمون تو بعض اوقات دوسرے مذہب کے اہل علم کے چھپ جاتے ہیں' لیکن ایڈیٹر دوسرے مذہب کے کسی شخص کو نہیں بنایا جاتا۔ ایڈیٹر اسی کو بنایا جاتا ہے جو اس مذہب سے وابستگی اور تعلق رکھتا ہو۔ مرزائیوں کے کسی رسالے یا اخبار کا ایڈیٹر بہرحال مرزائی ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کیا ہیں؟ وہ مرزائی رسالے کے ایڈیٹر کس حیثیت سے بنے؟ کیا اس قسم کے شخص کو ادارہ ثقافت اسلامیہ کا اکیڈمک ڈائریکٹر بنایا جا سکتا ہے؟ اس کردار کا شخص اسلام کی کیا ترجمانی کرے گا؟ کیا ادارہ ثقافت اسلامیہ کے روبہ زوال ہونے کا باعث یہی تو نہیں؟

امیر تنظیم اسلامی کا ایک نہایت جامع درس قرآن

بعنوان:

اطاعت کا قرآنی تصور

کتابی شکل میں دستیاب ہے

صفحات ۴۴' قیمت ۷ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور

ایک ملین ڈالر کہاں گئے؟

۱۶ / اپریل ۱۹۹۶ء کو حکومت کے تحت کام کرنے والے ۱۳ اداروں کے سربراہوں کو وزیراعظم سیکرٹریٹ سے ایک میمورنڈم بھیجا گیا تھا کہ "ایک اہم قومی پبلسٹی کی کوشش پر غور کرنے کے لئے ۲۱ / اپریل کو ۱۱ بجے وزیراعظم سیکرٹریٹ میں ایک اجلاس منعقد ہو گا جس کی صدارت وزیراعظم کے پرنسپل سیکرٹری کریں گے۔ براہ کرم اجلاس میں آپ خود تشریف لائیں"۔

جن سربراہوں کے نام پر میمورنڈم جاری کیا گیا تھا وہ یہ ہیں: سیکرٹری فنانس' چیئرمین بینکنگ کونسل' وائس چیئرمین' ایکسپورٹ پروموشن بیورو' ایم۔ ڈی' پی۔ آئی۔ اے' چیئرمین پی۔ ٹی۔ سی' چیئرمین سٹیٹ لائف' چیئرمین نیشنل انشورنس' نیشنل بنک' حبیب بنک' الائیڈ بنک اور مسلم کمرشل بنک کے پریذیڈنٹ' چیئرمین این۔ ڈی۔ ایف۔ سی' ایم۔ ڈی' این۔ آئی۔ ٹی' ایم۔ ڈی' آئی۔ سی۔ پی' ایم۔ ڈی' این۔ ایس۔ سی۔

وزیراعظم کے پرنسپل سیکرٹری' احمد صادق نے' جن کی صدارت میں اجلاس ہو رہا تھا' شرکاء سے کہا کہ حکومت نے بیرون ملک ایک "قومی پبلسٹی کاوش" کا فیصلہ کیا ہے اور ان ۱۳ اداروں کو اس مقصد کے لئے کم از کم ایک ملین ڈالر کا فوراً بندوبست کرنا ہے جو فارن ایکسچینج میں ہونے چاہئیں۔ چنانچہ چند ہفتوں کے اندر یہ رقم جمع کرا دی گئی تھی مگر اس کے بعد ۵ ماہ ہو چکے ہیں نہ "قومی پبلسٹی کاوش" کا کہیں اتہ پتہ ہے نہ ایک ملین ڈالر کا۔ (دی نیوز)

طالبان' افغان جہاد کا ہی تسلسل ہیں

افغانستان میں طالبان کی کامیابی سے اس خطے میں اسلام کے نفاذ کی راہ ہموار ہو گی

شریعت کے نفاذ سے اسلام کے عدل اجتماعی کے تقاضے پورے نہیں ہوتے

سردار اعوان

گزشتہ ماہ کے آخر میں کابل پر طالبان کے قبضہ کے بعد شمالی افغانستان میں لڑائی نہایت شدت اختیار کر گئی ہے جہاں طالبان کو مسعود اور دوستم کی مشترکہ طاقت کا سامنا ہے اور بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ طالبان کو سخت مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ اس دوران پاکستان کے انگریزی اخبارات میں زیادہ تر اس خدشے کا اظہار کیا گیا ہے کہ پاکستان کو' جو طالبان کی کامیابی کے لئے بڑا بے تاب تھا لینے کے دینے پڑ جائیں گے کیونکہ افغانستان میں قدم جمانے کے بعد طالبان لامحالہ پاکستان کا رخ کریں گے' جہاں مسلسل عدم استحکام کے سبب بیرونی مداخلت کے لئے پہلے ہی فضا تیار ہے۔ پاکستان کے بعض سرحدی علاقوں' مثلاً دیر اور باجوڑ وغیرہ میں جہاں کچھ عرصہ پہلے نفاذ شریعت کی تحریک کو حکومت سختی سے کچلنے میں کامیاب ہو گئی تھی' طالبان کی کامیابی جادو کا کام کرے گی۔ خاص کر طالبان نے اپنے علاقوں میں امن عامہ کے سلسلے میں جس قابل رشک کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے یہاں کے عوام متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ بلکہ ایک صاحب نے تو اپنے ایک خط میں جو ڈان میں شائع ہوا ہے یہ کہہ بھی دیا ہے کہ طالبان جہاں جاتے ہیں ایک دن میں امن و امان قائم ہو جاتا ہے لہٰذا پاکستان میں ان کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔ مگر ملک کے دانشور طبقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان میں گزشتہ نصف صدی میں جو جدید کلچر پروان چڑھا ہے چونکہ اس کی نشوونما میں اس طبقہ کا خون پسینہ بھی جذب ہوا ہے لہٰذا جیتے جی وہ اسے طالبان کے ہاتھوں خاک میں ملتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ اگر دیکھا جائے تو ہمارے دانشور طبقہ کی یہ تشویش بلاوجہ نہیں۔ بیوروکریسی کی ملی بھگت سے جاگیرداری اور سرمایہ داری کی گود میں پلنے والا سیکولر کلچر یہاں کے عوام کی گھٹی میں پڑ چکا ہے۔ ملک معاشی طور پر تباہ ہو جائے' اخلاق کا دیوالہ نکل جائے' کرپشن' ڈاکے' قتل و غارت وبا کی شکل اختیار کر جائیں مگر وڈیو فلمیں' ٹی وی' فحاشی اور عریانی اکثریت کے لئے زندگی کا جزو لازم بن چکے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ محض شریعت کے نفاذ سے اسلام کے عدل اجتماعی کے تقاضے پورے نہیں ہوتے مگر مروجہ ازکار رفتہ تعزیری قوانین کی جگہ شریعت کا نفاذ ایسا کوئی غلط کام بھی نہیں جس پر تشویش ظاہر کی جائے۔ اس سے امن و امان کے مسئلے کو حل کرنے میں بہرحال مدد ملے گی۔

طالبان کی کامیابی کا اصل راز کیا ہے' اس بارے میں مسلسل یہ بات سننے میں آتی رہی ہے کہ اس کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ ہے جو پاکستان اور سعودی عرب کے ذریعے اپنے عالمی مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ مقاصد کیا ہیں' ان کے بارے میں کئی آراء پائی جاتی ہیں۔ کچھ عرصے پہلے تک یہ کہا جا رہا تھا کہ طالبان اور بعد میں ظاہر شاہ کو آگے لا کر امریکہ افغانستان میں "سنٹر" اسلامی حکومت کے قیام کو روکنا چاہتا ہے۔ ابھی حال ہی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ امریکہ دراصل ایران کی بنیاد پرست مسلمان حکومت کا گھیرا تنگ کرنا چاہتا ہے تاکہ ایران کے پڑوسی مسلمان ممالک خصوصاً وسطی ایشیاء کی ریاستوں میں ایران کے اثر و رسوخ کے نفوذ کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو۔

اس کی ایک وجہ تو مذہبی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شیعہ اسلام کے مقابلے میں امریکہ سعودی طرز کا سنی اسلام بے ضرر خیال کرتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ معاشی ہے۔ امریکہ کی نظر وسطی ایشیا کی ریاستوں میں موجود بے پناہ قدرتی وسائل پر ہے۔ چنانچہ ایک خبر یہ ہے کہ افغانستان میں جاری جنگ کا مقصد بحیرہ کیسپین میں موجود تیل اور قدرتی گیس کے وسیع ذخائر تک رسائی حاصل کرنا ہے اور کابل کی نئی حکومت نے امریکی تیل کمپنی Unocal کو ترکمانستان سے افغانستان اور پاکستان کے راستے پائپ لائن بچھانے کا کام شروع کرنے کا اشارہ بھی دے دیا ہے۔

آخر میں آئیں یہ جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کھیل میں ہمارے لئے کیا راہنمائی ہے۔ جہاں تک طالبان کا تعلق ہے بظاہر ایسی کوئی بات دکھائی نہیں دیتی جس پر کوئی زیادہ حیرت کا اظہار کیا جا سکے۔ روس اور افغانستان میں اس کی پٹھو حکومت کے خلاف جہاد کئی دھڑوں نے آپس میں مل کر کیا تھا مگر دنیا کی عظیم ترین کامیابی حاصل کرنے کے بعد بدقسمتی سے یہ دھڑے مل کر افغانستان میں حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے جس کی وجہ سے مایوسی اور بددلی پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ یہ دراصل اسی کا ردعمل تھا کہ دو سال قبل ایک افغان کمانڈر' ملا عمر کی سرکردگی میں طالبان کے نام سے ایک نیا گروہ وجود میں آیا۔ طالبان کے نام سے جو یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ پاکستان اور افغانستان کی سرحد کے ساتھ قائم دینی مدرسوں سے طلبہ کو لے کر یہ نیا لشکر تیار کیا گیا ہے اور اس بنا پر اس حیرت کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یہ طلبہ یکایک کیسے جنگی جہاز اڑانے لگ گئے اور ٹینک استعمال کرنے شروع کر دیئے تو یہ بات غالباً درست نہیں ہے۔ دراصل اس گروہ میں صرف ان افغان مجاہدین کو شامل کیا گیا ہے جن کا کسی نہ کسی درجے میں مدرسے سے تعلق رہا ہو جبکہ اس سے قبل مختلف مجاہدین دھڑوں میں تمام لوگ شامل تھے خواہ ان کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبے سے تھا۔ یعنی مختلف افغان دھڑوں میں موجود خالص مذہبی لوگ وہاں سے نکل کر ملا عمر کی زیر قیادت طالبان کے نام سے منظم ہو گئے ہیں اور ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب ہی ایک قیادت میں جمع ہیں۔ لہٰذا طالبان درحقیقت افغان جہاد کا ہی تسلسل ہیں اور اگر مختلف دھڑوں میں بٹے ہوئے افغان مجاہدین نے روس جیسی سپر طاقت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا تو ایک قیادت میں منظم یہ لوگ کیوں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

افغان جہاد میں امریکی اسلحے اور مالی امداد نے جو کردار ادا کیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن ظاہر ہے کہ اصل کردار افغان مجاہدین اور افغانستان کے عوام نے ادا کیا ہے جنہوں نے لاکھوں کی تعداد میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ ان کے گھر بار' مال مویشی' ذرائع معاش غرضیکہ سب کچھ تباہ ہو گیا ہے۔ یہ انہی لازوال قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ پورے عالم اسلام میں عزت اور وقار سے جینے کی آرزو جنم لے رہی ہے۔ امریکی عزائم یا پاکستان' سعودی عرب اور مصر جیسے مسلمان ممالک کے حکمرانوں کی مجبوریاں اپنی جگہ' لیکن دنیا بھر کے مسلمانوں کی ہمدردیاں اور دعائیں جس طرح سابق افغان مجاہدین کے ساتھ تھیں اسی طرح اب طالبان کے ساتھ ہیں کیوں کہ افغانستان میں باہمی خانہ جنگی کے خاتمہ اور امن و امان کی بحالی کی یہی اب ایک صورت ہے کہ طالبان کو فیصلہ کن بالادستی حاصل ہو اور اس کے بعد ہی اس سرزمین کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا کام کرنے کے لئے مرکز کی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔

بقیہ : ایڈیٹر کے ڈیسک سے

عمران نذر حسین کا تعلق ٹرینڈاڈ (جزائر عرب الہند) سے ہے' ان کے والد ہندوستانی تھے جبکہ والدہ فرانسیسی تھیں۔ مولانا ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن انصاری ؒ کی تبلیغ کے نتیجے میں جناب عمران حسین ۶۰ء کی دہائی میں کراچی آئے اور علیمیہ انسٹی ٹیوٹ سے دینی تعلیم کی تحصیل کی اور اس کے ساتھ ساتھ کراچی یونیورسٹی سے بی اے (آنرز) اور ایم اے (فلسفہ) بھی کیا۔ عمران حسین صاحب نے الازہر یونیورسٹی اور جنیوا کے گریجویٹ انسٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹڈیز سے بھی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے ٹرینڈاڈ اور ٹوباگو کی حکومت میں محکمہ امور خارجہ کی ملازمت ترک کر کے کل وقتی طور پر خود کو خدمت دین کے لئے وقف کر دیا۔ عمران حسین صاحب اس وقت نیویارک اور نیو جرسی کی ۱۵ مسلم تنظیموں کی جوائنٹ کمیٹی کے لئے بطور ڈائریکٹر علوم اسلامی کام کر رہے ہیں۔ جناب عمران این حسین کئی کتابوں کے مصنف ہیں' انہیں خطبات اور تقاریر کے لئے دنیا کے مختلف ملکوں میں مدعو کیا جاتا ہے۔OO

امیرالمومنین

دو سال پہلے ملا محمد عمر کو صوبہ قندھار کے میوند ضلع میں اپنے قریبی حلقوں کے باہر کوئی جانتا تک نہ تھا۔ آج افغانستان میں اس سے زیادہ کوئی طاقتور شخص نہیں۔ ۳۵ سالہ ملا عمر قندھار کے ایک گاؤں نودیہہ (Nodeh) میں پیدا ہوئے تھے لیکن اب ان کا خاندان میوند ضلع کے کنکی نخود علاقے کے سنگیسر گاؤں میں رہ رہا ہے۔

دراز قد' مضبوط جسم کے ملا عمر کی دائیں آنکھ افغان جہاد میں ضائع ہو گئی تھی۔ روسی فوجوں اور افغان کیمونسٹوں کے خلاف جنگ میں چار مرتبہ زخمی ہوئے اس دوران راکٹ لانچر سے کئی ٹینکوں کو نشانہ بنانے پر انہیں بہترین نشانہ باز کی شہرت حاصل ہوئی۔ جنگ کے دوران وہ حزب اسلامی (خالص) کے کمانڈر نیک محمد کے تحت لڑتے رہے لیکن جب افغانستان میں مجاہدین کی اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو واپس اپنے مدرسہ میں آ گئے جہاں سے اپنی مذہبی تعلیم درمیان میں چھوڑ کر جہاد کے لئے چلے گئے تھے۔ ملا عمر نمائش وغیرہ پسند نہیں کرتے اور زیادہ تر صحافیوں سے دور رہتے ہیں۔ انہیں خود خاموش رہ کر دوسروں کی باتیں سننا پسند ہے۔ اکثر جب طالبان لیڈر اہم معاملات پر تبادلہ خیالات کر رہے ہوتے ہیں تو وہ ایک طرف خاموش بیٹھے سنتے رہتے ہیں لیکن طالبان کے ساتھ خوب گھل مل جاتے ہیں اور مزے لے لے کر جنگ کے قصے بیان کرتے ہیں۔

نہایت سادہ شخص جس کی کھانے پینے اور لباس وغیرہ کی ضروریات نہ ہونے کے برابر' اپنی حفاظت سے بالکل لاپرواہ نظر آتے ہیں۔ قندھار کے گورنر ہاؤس میں اکثر لان میں عام لوگوں کے ساتھ آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور لوگوں سے ملتے رہتے۔ اگرچہ وہ کوئی بڑے خطیب یا عالم دین نہیں ہیں لیکن اپنے یقین اور خدا ترسی کے باعث انہیں لوگوں میں زبردست مقبولیت حاصل ہے۔ ان کی خاندانی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ گزشتہ سال انہوں نے بتایا تھا کہ ان کا ایک بیٹا ہے' ان کا گھر اور مدرسہ گارے کا بنا ہوا ہے۔ افغان جہاد کے دوران دوسرے مجاہدین کے برعکس انہوں نے کبھی پاکستان کا رخ نہیں کیا۔

ملا عمر کا کہنا ہے کہ انہوں نے بڑے دکھی دل کے ساتھ دوبارہ بندوق اٹھانے کا فیصلہ کیا اور وہ بھی اپنے مجاہدین کے خلاف کیونکہ ان کی لوٹ مار' ڈاکوؤں اور اخلاقی گراوٹ کے قصے برداشت سے باہر ہو گئے تھے۔ خاص کر نادر جان' صالح اور دارو جان جیسے بعض بدنام کمانڈروں نے' جن کے مراکز ملا عمر کے گاؤں کے قریب تھے' لڑکیوں کے اغوا سے تمام حدیں عبور کر لی تھیں۔ جس پر ۳۰ ہم خیال ساتھیوں کے انہوں نے اس مہم کا آغاز کیا جس کا مقصد افغانستان میں امن و امان کا قیام اور اسلامی قوانین کا نفاذ ہے۔

چھ رکنی طالبان حکمران کونسل

ملا محمد ربانی : طالبان اسلامی تحریک میں دوسرے نمبر پر' عبوری حکمران کونسل کے سربراہ۔ عمر ۳۸ سال' صوبہ قندھار سے تعلق' حزب اسلامی (خالص) میں شامل ہو کر افغان جہاد میں حصہ لیا۔ ملا عمر کے نائب ہونے کی وجہ سے حاجی معاون کے نام سے مشہور ہیں۔

ملا محمد حسن : اب تک قندھار کے گورنر تھے۔ طالبان کی مرکزی شوریٰ کے نہایت بااثر رکن ہیں۔ قندھار سے تعلق ہے۔

ملا محمد غوث : طالبان حکومت کے وزیر خارجہ' امریکہ اور بعض یورپی ممالک کا دورہ کر چکے ہیں اور پاکستان اور ایرانی حکام کے ساتھ مذاکرات کرتے رہے ہیں۔ سب سے زیادہ عالم فاضل ملا' قندھار سے تعلق ہے۔

ملا سید غیاث الدین آغا : حکمران شوریٰ میں واحد غیر پشتون رکن' فارسی بولنے والا تاجک' بدخشاں سے تعلق'

ملا فاضل محمد : اردگان صوبے سے تعلق' طالبان میں تیزی سے اوپر آنے والا شخص' حکمران کونسل کا رکن ہونے کے علاوہ کابل شہر کے سیکورٹی کمانڈر کا اہم عہدہ ان کے پاس ہے۔

ملا عبدالرزاق : حکمران کونسل میں واحد سپاہی جنہوں نے افغان جہاد میں حزب اسلامی (خالص) کے ایک کمانڈر کے طور پر جنگ میں حصہ لیا۔ اس سے قبل طالبان تحریک کے فوجی کمانڈر ملا بورجان کے جو کابل کی لڑائی میں شہید ہو گئے تھے نائب کے طور پر مقرر تھے۔

"چاہ کن را چاہ در پیش"

ایک اسلامی معاشرے میں سربراہ مملکت سمیت کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہوتا

میم سین

میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل کی خبر پر مجھے رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو اس نے مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان عصبیت کو ہوا دینے کے لئے کہے تھے۔ "ہماری اور ان قریش کے کتوں کی حالت پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کر تا کہ تجھی کو پھاڑ کھائے"۔ سیرت کے اس اہم واقعے پر گفتگو تو بعد میں ہوگی۔ پہلے میں یہ بتادوں کہ مجھے یہ الفاظ اس موقع پر کیونکر یاد آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ کراچی میں دہشت گردی پر قابو پانے کے لئے حکومت نے قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کو فری ہینڈ دیا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج پولیس والوں کے ہاتھ وزیر اعظم کے برادر خورد کے خون سے رنگین نظر آتے ہیں۔ جب قانون نافذ کرنے والوں کے اختیارات پر قانونی قدغنیں ختم کر دی جائیں تو اس کا نتیجہ اسی قسم کے واقعات کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ حکومت ہی کا کیا دھرا ہے۔ کتنی مائیں' بہنیں' بیٹیاں اور بیٹے کراچی میں ایسے ہیں جن پر یہی کچھ بیت چکا ہے۔ کاش کہ وزیر اعظم صاحبہ ان کے درد کو محسوس کرتیں اور اپنے اختیارات کا درست استعمال کرتیں اور ایجنسیوں کو لگام دیتیں تو یقیناً آج یہ نوبت نہ آتی۔ لیکن مثل مشہور ہے کہ "چاہ کن را چاہ در پیش"۔ ضروری ہے کہ اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ ایک اسلامی معاشرے میں سربراہ مملکت سمیت کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نبی اکرمؐ سے عشق کے بلند بانگ دعوے تو کرتے ہیں لیکن ان کے اسوۂ حسنہ پر عمل ہمارے لئے دنیا کا مشکل ترین کام ہے جبکہ ان کے اسوۂ مبارک میں ہمارے لئے مکمل رہنمائی موجود ہے۔ وطن عزیز آج جس شدید ترین لسانی اور مذہبی فرقہ واریت کی لپیٹ میں ہے اس کا حل بھی ہمیں وہیں سے مل سکتا ہے بشرطیکہ ہمیں سرت سرور عالمؐ کے معروضی مطالعہ کا شوق اور اس پر عمل کا جذبہ ہو۔ حکمرانوں پر بدرجہ اولیٰ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی مشغولیات میں سے کچھ وقت اس کے لئے وقف کریں میں آپ کو سیرت سرور کائناتؐ سے دو مثالیں پیش کر رہا ہوں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ داعی و مزکی اعظمؐ کی حیات طیبہ میں بھی لوگوں نے عصبیتوں کو بھڑکانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا لیکن یہ نبوی فراست تھی جس کے نتیجہ میں شرپسندوں کے عزائم خاک میں مل گئے۔ ہمارے حکمرانوں کے لئے ان میں رہنمائی موجود ہے لیکن بات پھر وہیں آتی ہے کہ جب تک ہم حضورؐ کی سیرت پر عمل نہیں کرتے' محض زبانی وعظ و نصیحت اور تعلیم و تلقین سے مثبت نتائج حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ لوگ تو یہ دیکھتے ہیں کہ جو انہیں وعظ کر رہا ہے اس کا عمل اس سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔

ایک غزوے سے واپسی کے موقع پر پانی بھرنے کے مسئلہ پر ایک مہاجر اور ایک انصار میں جھگڑا ہو گیا۔ تو تکرار میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ طیش میں آکر مہاجر نے انصار کو ایک لات رسید کر دی۔ بس پھر کیا تھا۔ ایام جاہلیت کی عصبیت ایک بار پھر ان میں عود کر آئی۔ اور دونوں نے اپنے اپنے گروہوں کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔ شور وغل کی آواز سن کر حضورؐ اپنے خیمے سے باہر تشریف لائے اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس ہستی کو جسے عصبیتوں کے خاتمے کے لئے جان توڑ کوشش کرنی پڑی تھی اس صورت حال کو دیکھ کر کتنا صدمہ ہوا ہوگا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ جاہلیت کا نعرہ کس لئے؟ خیر معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ لیکن عبداللہ ابن ابی تو موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ اس موقع پر اس نے وہ الفاظ کہے جو مضمون کے شروع میں درج کئے گئے ہیں۔ زید بن ارقمؓ ایک کمسن صحابی موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں یہ اطلاع پہنچائی۔ اس موقع پر عبداللہ ابن ابی نے جو دوسری باتیں کی تھیں اس کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں درج کیا ہے۔ "یہی وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ان پر خرچ نہ کرو جو حضورؐ کے پاس ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ اگر ہم مدینہ واپس پہنچ گئے تو عزت والے ذلیلوں کو نکال باہر کریں گے"۔ آج ہم میں بھی یہ جاہلیت موجود ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ کوئی کسی کو سمندر میں غرق کرنے کی بات کرتا ہے تو کوئی شہر در کرنے کی۔ بہرحال قرآن کریم نے منافقین کو جواب دیا کہ زمین اور آسمان کے سارے خزانے اللہ کے لئے ہیں لیکن یہ منافق سمجھ نہیں رکھتے اور یہ کہ عزت تو بس اللہ کے لئے ہے یا اس کے رسول کے لئے یا پھر مومنین کے لئے ہے لیکن یہ منافق اس کا علم نہیں رکھتے۔ بہرحال حضرت عمرؓ نے رسولؐ سے اجازت طلب کی آپ حکم دیں تو میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا نہیں۔ دوسروں کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کی گردن اڑا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عبداللہ ابن ابی کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ نے مدینہ کے قریب پہنچتے ہی اپنے والد کو روک لیا اور کہا کہ تو نے یہ کہا تھا کہ مدینہ پہنچ کر عزت والے ذلیلوں کو باہر نکال دیں گے لہٰذا تو مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن حضورؐ کی اجازت دینے پر وہ اپنے والد کے راستے سے ہٹ گئے۔

ایک اور غزوے کے بعد تالیف قلب کے لئے اہل قریش کو مال غنیمت میں سے کچھ زیادہ حصہ دیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مکہ فتح ہوا تھا اور کثیر تعداد میں اہل قریش اسلام میں داخل ہوئے تھے جس کے لئے قرآن نے "فوج در فوج" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ فتح مکہ بعد یہ غزوہ واقع ہوا تھا۔ منافقوں کو پروپگنڈے کا ایک اور موقع ہاتھ آگیا۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی جانے لگیں۔ "جب جان دینے کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم یاد آتے ہیں اور جب غنیمت کی تقسیم کا موقع ہوتا ہے تو اپنے قبیلے والے"۔ وغیرہ وغیرہ۔ آپؐ کو ان چہ میگوئیوں کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے تمام انصار کو طلب کر کے ان سے خطاب فرمایا۔ اے معشر الانصار! کیا یہ درست نہیں کہ تم گمراہ تھے اللہ

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

چیدہ چیدہ

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

آزاد کشمیر میں نئی حکومت نے اقتدار میں آتے ہی پہلا "نیک" کام یہ کیا ہے کہ محکمہ امر بالمعروف کے تمام مفتی صاحبان کو جن کی تعداد سترہ ہے' برطرف کر دیا گیا ہے۔ اس طرح عملاً محکمہ امر بالمعروف کو ختم کر دیا گیا ہے۔ حکومت کا کہنا ہے کہ آزاد کشمیر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے دفعہ ۲۲ کے تحت مستقل ہونے والے ملازمین کو کوئی تحفظ نہیں دیا بلکہ دفعہ ۲۲ کے تحت تقرر کو غلط قرار دیا ہے۔ جبکہ مفتیوں پر دفعہ ۲۲ کا سرے سے اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ مفتی صاحبان کو صدر حکومت کی سربراہی میں ایک مستقل تشکیل شدہ بورڈ نے باقاعدہ آسامیاں مشتہر کرنے کے بعد پبلک سروس کمیشن میں جمع درخواستوں کی بنیاد پر تحریری اور تقریری امتحان لے کر منتخب کیا تھا۔ وزیر قانون اور مذہبی امور نے مفتیوں کو برطرف کرنے کے بعد ۹۶/۸/۲۸ کو سماعت کے لئے بلایا۔ یوں انہوں نے فیصلہ صادر کرنے کے بعد مظلومین کو دادرسی کے لئے بلا کر صرف رسمی کارروائی کی اور علماء جب اجلاس سے اٹھ کر چلے گئے تو بعض ذمہ دار حضرات کے سامنے وزیر قانون چاچا علی محمد نے یوں تبصرہ کیا کہ "ان مولویوں کو ابھی ہم نے کرسیوں سے اتارا ہے' ان کو ماتم کرنے دو اور ان کی منبروں پر بک بک کو بھی ختم کر دیں گے" وزیر قانون کے نزدیک گویا منبروں پر دیئے جانے والے خطبے بک بک ہیں !!

(مجلس افتاء' آزاد جموں و کشمیر)

ہم ٹیکس کیوں دیں؟

پاکستان کے عوام اپنے قوامی اداروں پر اعتماد نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے ٹیکس ان کی اپنی فلاح و بہبود کے بجائے حکمرانوں اور افسروں کے آرام و آسائش بلکہ عیاشیوں کے لئے خرچ ہوں گے۔ حالیہ قومی بجٹ میں چالیس بلین روپے سے زائد کے ٹیکس لگا دیئے گئے جنہیں عوام صریحاً غیر منصفانہ سمجھتے ہیں' اس لئے کہ انہیں خوب معلوم ہے کہ حکومت کس طرح فضول خرچی میں قومی دولت ضائع کرتی ہے۔ جہاں عام لوگوں کی روز مرہ کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں وہاں صدر' وزیراعظم' وزراء اور ارکان پارلیمنٹ کی تنخواہوں میں اضافہ کر دینا کہاں کا انصاف ہے؟ عوام کے لئے پبلک ٹرانسپورٹ فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے' لیکن اگر بسیں خریدنے کے لئے حکومت کے پاس روپیہ نہیں ہے تو وزرائے اعلیٰ کو ڈیوٹی فری گاڑیاں درآمد کر کے غیر معمولی نفع پر بیچ دینے کی سہولت کس اصول کے تحت دی گئی ہے؟ جس ملک میں عوام کی اکثریت کو رہائش کی معقول سہولتیں حاصل نہ ہوں وہاں ۷۰ ملین روپے سے وزیراعظم کا نیا سیکرٹیریٹ تعمیر کرنا' ۵۶ ملین روپے سے وزیراعظم ہاؤس کی تعمیر نو اور آرائش کرنا' اور ۷ ملین روپے سے صدر کے لئے سوئمنگ پول بنانا انتہائی درجے کا ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ OO (بشکریہ : دی نیوز' ۲۱/اگست ۹۶ء)

یہ پاکستان ہے!

☆ وفاقی وزیر' جناب لغاری کے مطابق نواز شریف ملک سے ۶۰۰ ارب روپے نکال کر لے گئے ہیں۔
☆ ایک مشہور سندھی ایم۔ این۔ اے' جنہوں نے ۱۹۹۴ء میں ۱۱،۰۰۰ روپے انکم ٹیکس ادا کیا' اگلے ہی سال کلفٹن میں ۵ کروڑ روپے کی لاگت سے ایک محل تعمیر کر لیا۔ یہ محل ان کے ان پر آسائش مکانوں کے علاوہ ہے جو پیرس اور لندن میں ہیں۔
☆ کے۔ ڈی۔ اے نے اوپر سے دباؤ کے تحت عوامی مرکز سے ملحق ۵۰ کروڑ روپے مالیت کا پلاٹ اڑھائی کروڑ میں فروخت کر دیا۔
☆ سکھر جیل سپرنٹنڈنٹ نے مان لیا کہ اس نے جیل توڑنے کی اجازت دینے کے عوض ۲۴ لاکھ روپے رشوت لی تھی۔
☆ وزیراعظم ہاؤس کی تعمیر پر جو کئی برسوں سے جاری ہے لاگت کا تخمینہ ۷۰ کروڑ روپے ہے۔
☆ وزیراعظم ہاؤس اور ایوان صدر کے معمول کے اخراجات ۷ کروڑ روپے سالانہ ہیں۔
☆ کراچی میں ایک کار کی نمبر پلیٹ پر لکھا تھا۔ "ایم۔ این۔ اے کا بھائی"۔
☆ ہیتھرو ایئرپورٹ پر متعین پی۔ آئی۔ اے کے ۱۲ اہلکاروں کو سرے محل کے لئے بھیجے جانے والے سامان کا راز افشا کرنے کے شک میں معطل کیا گیا۔
☆ بن قاسم پر کے۔ ای۔ ایس۔ سی کے ۱۰۰ کروڑ روپے لاگت کے سمولیٹر (Simulater) کی گذشتہ ۱۱ سال سے استعمال کی نوبت نہیں آئی۔
☆ پاکستان سٹیل نے بازار میں ۴۰۰۰ ڈالر قیمت کے آلات ۷۰۰،۰۰۰ ڈالر میں خریدے۔
☆ گزشتہ ۶ سالوں میں اسلام آباد میں ۹ ہزار پلاٹ برائے نام قیمت پر بیوروکریٹس کو الاٹ کئے گئے۔